دیویندر اسر
کینوس کا صحرا

کینوس کا صحرا

(افسانوں کا مجموعہ)

کینوس کا صحرا

دیویندر اِسّر

پبلشرز اینڈ ایڈورٹائزرز۔ جے۔۶ کرشن نگر
دہلی۔۱۱۰۰۵۱

کینوس کا صحرا

(افسانوں کا مجموعہ)

سال اشاعت : ۱۹۸۲

مصنف : دیویندر اسّر

مطبع : نعمانی پریس دہلی

قیمت : تیس روپے

CANVAS - KA - SEHRA

PRICE Rs. 30/-

فہرست

نیند ۹

کالے گلاب کی صلیب ۱۶

تین خاموش چیزیں اور ایک زرد پھول ۲۷

سیاہ تل ۳۵

پرانی تصویر نئے رنگ ۴۲

روح کا ایک لمحہ اور سولی پہ پانچ برس ۵۲

گلٹین ۶۰

بجلی کا کھمبا ۷۲

میں وینس اور دو ہاتھ ۸۰

کالی بلی ۸۸

مردہ گھر ۹۳

مفرور ۱۰۴

کینوس کا صحرا ۱۱۵

ایک پری کتھا ۱۲۴

بچہ رو رہا ہے ۱۳۳

اساس کی کوئی منزل نہیں ۱۴۳

ہم شہر بدل گئے ۱۵۲

جانے کل ہوں کہاں ساتھ اب ہوا کے ہیں

ہم پرندے مقامات گم شدہ کے ہیں

باقیؔ

نیند

شام کو جب میں گھر لوٹا تو نریش نے خبر سنائی کہ ایرا اسپتال میں ہے۔

"کیوں کیا ہوا ؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔ ابھی دو روز پہلے ہی ایک پارٹی میں اس سے ملاقات ہوئی تھی اسے بظاہر کوئی تکلیف نہیں تھی۔ اور نہ ہی اس نے کبھی کسی مرض کا ذکر کیا ہے۔ یہ اچانک اسپتال تک نوبت کیسے پہنچ گئی۔

"کیا کوئی حادثہ ہو گیا؟" میں نے پوچھا۔

"حادثہ ہی سمجھئے" نریش نے مختصر سا جواب دیا جیسے وہ پوری بات کہنے سے گریز کر رہا ہو۔

"پھر بھی، کیا ہوا ؟" میں نے پوچھا۔

"اس نے خودکشی کرنے کی کوشش کی تھی۔ لیکن کامیاب نہیں ہوئی۔" نریش نے جواب دیا۔

"خودکشی ! کیوں ! کیسے ؟ میں بالکل حیران رہ گیا۔ خودکشی کی کوئی وجہ نظر نہیں آتی تھی۔

"اس نے ڈھیر ساری نیند کی گولیاں کھالیں تھیں اور بیہوشی کی حالت میں اسے بہ مشکل اسپتال پہنچایا گیا۔ اگر ذرا بھی دیر ہو جاتی تو بس ـــ" نریش یہ کہہ کر خاموش ہو گیا۔

"یہ حادثہ بھی ہو سکتا ہے اور ارادی کوشش بھی" میں نے سوچا۔

میں نے جلدی جلدی ایک پیالی چائے کی حلق میں انڈیلی اور اسپتال کی

طرف بھاگا اور راستے میں ایرا کے بارے میں سوچتا رہا۔ ایرا دلکش لڑکی ہے۔ پڑھی لکھی ہے۔ اور شائستہ بھی۔ سنگیت میں اس کی دلچسپی تو پاگل پن کی حد تک ہے۔ وہ خود بھی اچھا ستار بجاتی ہے۔

ابھی دو ایک سال ہوئے اس کی شادی کو کتنا بڑا بزنس ہے اس کا اور وہ ایرا کی ہر خواہش پوری کرتا ہے۔ اس کے لئے گھر میں کیا کچھ نہیں جمع کر دیا اس نے ہر آسائش موجود ہے اور پھر کچھ کام نہیں کرنا پڑتا ایرا کو نوکر چاکر ہر کام کیلئے موجود ہیں۔

ابھی کچھ ہی روز ہوئے مجھے کسی کام کے سلسلے میں ایرا کے گھر جانا پڑا۔ شاید دوپہر کا وقت تھا۔ میں گیٹ سے اندر داخل ہوا۔ سامنے ڈرائنگ روم سے روی شنکر کی ستار کی دھن کی آواز سنائی دی۔ روی شنکر میری بڑی کمزوری ہے میں نے دھیرے سے دروازہ کھولا اور اندر داخل ہوا۔ ریڈیو گرام بج رہا تھا دروازے اور کھڑکیوں پر گہرے ہرے رنگ کے پردے پڑے تھے۔ کمرے میں قریب قریب اندھیرا تھا اور روی شنکر کی ستار کی دھن تھی۔ شاید کمرے میں کوئی نہیں تھا، میں چپ چاپ ایک صوفے پر بیٹھ گیا اور سگریٹ سلگا لی۔

"آپ آگئے" کمرے میں ایرا کی آواز آئی۔ ریڈیو گرام کے بالکل قریب اس کے ساتھ اپنا سر ٹکائے ایرا بیٹھی تھی۔

"میں روی ہوں ۔۔" میں نے فوراً جواب دیا۔

"اوہ ۔۔" اس نے کہا اور پھر جیسے وہ ستار کے سنگیت میں تحلیل ہو گئی۔ جب پروگرام ختم ہوا تو وہ اٹھی اور کمرے میں روشنی کی۔

"معاف کرنا روی۔ کتنی دیر ہو گئی تمہیں آتے ہوئے چائے وغیرہ بھی نہیں پوچھی۔ کیا پیو گے؟" اس نے پوچھا۔

"کچھ نہیں۔ دراصل مجھے بہت جلدی واپس جانا تھا۔ ایک پارٹی سے بات چیت چل رہی تھی۔ نئی کالونی کے بارے میں اس سلسلے میں آیا تھا لیکن روی شنکر نے جکڑ لیا۔" میں نے کہا۔

"کبھی فرصت سے آؤ کچھ نئے ریکارڈ لائی ہوں۔ بسم اللہ خاں کی شہنائی اور بی تھوون کے۔"

اس نے کہا۔

"ضرور۔ کم بخت فرصت ہی نہیں ملتی"۔ میں نے کہا۔

"فرصت"۔ اس کی آواز میں جیسے مایوسی تھی۔

"ہاں کیا کریں بزنس کے چکر کچھ ایسے ہیں"۔ میں نے کہا۔

اتنے میں مسٹر کمار کمرے میں داخل ہوئے۔

"بڑی سخت بھوک لگی ہے کچھ تیار ہو تو جلدی سے لاؤ۔ ابھی بمبئی والوں کو وقت دیا ہے۔ انتظار کر رہے ہوں گے"۔ انہوں نے وہسکی کی بوتل کھولی۔

"کیوں بھائی روی ہو جائے ایک ایک دور ––" اس نے کہا۔

"آپ تو جانتے ہی ہیں میں نے شراب ترک کر دی ہے"۔ میں نے کہا۔

"واہ رے مہاتما بدھ۔ ارے بھائی یہ بدھ وُدھ بن کے بزنس نہیں چلنے کا۔ اس کے لئے سب کچھ کرنا پڑتا ہے۔ کیا کہتے ہیں سالے کو ––" انہوں نے ایک گھونٹ پیتے ہوئے کہا۔

"بدھو بن کے تو چلے گا نا! ایرا نے کہا۔

"تو اچھا ہم بدھو ہیں جو دن رات چکی کی طرح کام کرتے ہیں نہ کھانے کی سدھ نہ پینے کا خیال"۔

مسٹر کمار نے کہا۔

"پینے کا خیال تو ہے شاید کھانے کی سدھ نہیں"۔ ایرا نے کہا۔

"تم صاف صاف کیوں نہیں کہتیں تمہیں میرا پینا اچھا نہیں لگتا" وہ غصے سے بولے۔

"چھوڑیئے اس بحث کو۔ جاؤ ایرا کھانا لگواؤ ––" میں نے مسئلے کی سنجیدگی کو محسوس کرتے ہوئے کہا۔

"پیسہ پیسہ میں آخر پوچھتی ہوں کس لئے۔ پیسہ چاہیئے بزنس کے لئے بزنس چاہیئے پیسے کے لئے۔ پیسہ چاہیئے آرام کے لئے اور آرام ترک کیجیئے پیسے کے لئے۔ پیسہ چاہیئے گھر کے سکھ کے لئے۔ اور گھر کا سکھ چھوڑیئے پیسے کے لئے۔ تمہارا نروس بریک ڈاؤن ہو جائیگا کسی دن، دماغ گھوم جائے گا۔ آخر تم کیا چاہتے ہو۔ ہر وقت تناؤ، ہر وقت فکر، کبھی یہ زمین خریدلی، کبھی وہ بیچ دی۔ کبھی کار آئی کبھی گئی۔ میں تو پاگل ہو جاؤں گی۔ دو منٹ کسی کے ساتھ بات کرنے کو ترس جاتی ہوں" ایرا کا سارا جسم کانپ رہا تھا۔

"پیسہ اس لئے کہ تم سکون سے سارنگی دھن سن سکو" مسٹر کمار نے کہا

اس کی بات میں خلوص تھا یا طنز میں نہیں سمجھ سکا۔ ایرا کچن میں جا چکی تھی۔ مجھے ایرا کی بات ابھی تک یاد ہے۔" یہ سب دوڑ دھوپ کس لئے۔ یہ سب آرام و آسائش کس لئے، پیٹ بھر لیا۔ شراب پی لی۔ برج کھیل لیا۔ اور ایک دوسرے کو دینے کے لئے ہمارے پاس سوائے ننگے جسموں کے کیا رہ گیا ہے"

"ٹیکسی اسپتال کے پورچ میں آکر رکی اور میں نے رسپشنسٹ سے ایرا کے بارے میں پوچھا۔ اسپیشل وارڈ میں ایرا ایک بستر پر نیم دراز کوئی اخبار پڑھ رہی تھی۔ ڈاکٹر ابھی کمرے سے باہر ہی نکلا تھا۔ میں نے پوچھا۔

"اب کیا حال ہے؟"

"خطرے سے باہر ہے کوئی فکر کی بات نہیں پھر بھی میرا مطلب ہے کچھ ناخوشگوار بات نہ کریں۔" ڈاکٹر نے کہا اور چلا گیا۔

میرے قدموں کی آواز سے چونک کر ایرا نے کروٹ بدل کر دیکھا۔

"اوہ رومی تم یہاں کیسے ——؟" اس نے مسکرانے کی کوشش کی۔ بڑی کمزور سی مسکراہٹ تھی۔

"کیا بات ہے ایرا" میں نے اس کے سرہانے اسٹول پر بیٹھتے ہوئے پوچھا۔
"ابھی گھر واپس ہی لوٹا تھا کہ معلوم ہوا کہ تم اسپتال میں داخل ہو گئی ہو۔"

"کچھ نہیں NOTHING SERIOUS"۔ اس نے اخبار میز پر رکھتے ہوئے کہا۔
"لیکن ایکدم یہ سب کچھ کیسے ہوگیا"۔ میں سب کچھ جاننے کے لئے پریشان تھا۔
لیکن ایرا کا انداز کچھ ایسا تھا۔ جیسے کوئی خاص بات نہیں ہوئی۔ یہ بھی روزمرہ کی زندگی کا کوئی واقعہ ہے۔
"ایک دم ــــ" اس نے دہرایا ایک گھونٹ پانی پیا۔ ایسے ہی رات نیند نہیں آرہی تھی۔ نیند کی ایک گولی لی۔ نیند پھر بھی نہیں آئی۔ ایک گولی اور لی۔ اور جب نیند پھر بھی نہیں آئی تو ایک گولی اور لی اور پھر ایک اور پھر ایک اور اور۔ اندھیرے میں کچھ پتہ نہیں چلا اور پھر میں اتنا تھک گئی تھی کہ کچھ ہوش بھی نہیں تھا"۔
"لیکن نیند نہ آنے کی تمہاری پرانی شکایت ہے۔ شروع میں کسی قابل ڈاکٹر سے مشورہ کرلیتی تو یہ نوبت نہ پہنچتی"۔ میں اس طرح بات چیت کر رہا تھا جیسے واقعی یہ حادثہ تھا اور اس میں خودکشی کے ارادے کا کوئی دخل نہیں تھا۔
"وہاں ڈاکٹر سے مشورہ کیا تھا۔ وہ تو کہتے تھے کوئی خرابی نہیں علاج کس بات کا کریں۔ اور وہ کیا کہتے ہیں بڑا فیشن ہے۔ آجکل ان لوگوں کا ہاں PSYCHIATRIST ان کو بھی دکھایا۔ انہوں نے مشورہ دیا شادی کرلو۔ سو شادی بھی کرلی"۔ وہ تھوڑی دیر کے لئے رک گئی۔
" لیکن نیند پھر بھی نہیں آتی۔ سچ مانو روی میں نے زندگی میں کبھی کسی چیز کی اتنی خواہش نہیں کی تھی جتنی کہ نیند کی ــــ لیکن ــ" ایرا بستر پر لیٹ گئی۔
اس کا چہرہ پیلا پڑ گیا تھا اور وہ بہت کمزور اور بہت تھکی ہوئی نظر آرہی تھی۔ اس نے آنکھیں بند کرلیں۔ میں خاموش ہوگیا۔ شاید اسے کچھ آرام ملے۔ اس نے دھیرے دھیرے آنکھیں کھولیں۔ اپنی پیٹھ کے نیچے تکیہ رکھا اور اس کے سہارے بیٹھ گئی "اس روز پارٹی سے بڑی دیر سے گھر لوٹی، کھانا بڑی دیر سے ختم ہوا۔ عورتیں تھکنے ہونے کی شکایت بھی کرتی جاتی اور ٹھونس ٹھونس کر پیٹ بھی بھرتی جاتی تھیں۔ تم جانتے ہو مجھے سب کے سامنے بیٹھ کر کھانے سے کتنی نفرت ہے۔ تم مل بیٹھ کر کافی اور سگرٹ پی سکتے ہو۔ لیکن یہ میز دل کے

اردگرد ہجوم اکٹھے آدم خود بڑی بڑی دیگوں میں آدمی کا گوشت نوچ نوچ کر کھا رہے ہیں۔ اور پھر باتیں۔ کس کی نئی کار ہے۔ کس نے ریفریج لیا ہے۔ کون واشنگ مشین امپورٹ کر رہا ہے کس کا دیور فورج میں چلا گیا ہے۔ ساڑھی کتنے میں آئی ہے۔ اور لپ اسٹک کا کون سا شیڈ دلکش نظر آتا ہے۔ مرد الگ بزنس اور انکم ٹیکس کی باتیں کر رہے ہیں۔ اور پیسہ جمع کر کے پریشان ہو رہے ہیں۔ کسی کو بلڈ پریشر کی شکایت ہے۔ اور کسی کو السر کی۔ اور تم جانتے ہو کہ میں تو بڑی اجنبی سی محسوس کرتی ہوں ــــــــ" ایرا کہہ رہی تھی اور میں بڑی خاموشی سے اس کی باتیں سن رہا تھا۔

"اس روز بارہ ایک بجے ہم گھر لوٹے۔ راستے میں راج پتھ پر اچانک میری خواہش ہوئی کہ ننگے پاؤں نہر کے کنارے کنارے تھوڑی دیر گھاس پر چلیں۔ رات بڑی خوبصورت تھی۔ پورے چاند کی رات اور پانی میں اس کا عکس اور دو سائے اور درختوں کی پرچھائیاں اور ساکن پانی کی سطح اور مکمل سناٹا۔ میں نے ان سے کہا ذرا کار روکئے۔ بولے۔ کیا بات ہے؟ میں نے کہا ذرا گھومنا چاہتی ہوں۔ لیکن وہ نشے میں تھے اور گھر جلدی پہنچنا چاہتے تھے۔ بولے بہت تھک گیا ہوں۔ اور کچھ پی بھی زیادہ لی ہے۔ میں نے کہا ذرا اعتدال برتا کریں۔ بولے اعتدال کیسے برتیں بزنس ہی ایسا ہے۔ دماغ تھک جاتا ہے اور سوشل لائف ایسی ہے۔ سب کچھ کرنا پڑتا ہے۔

کار تیزی سے گھر کی طرف بھاگی جا رہی تھی۔ نہر دور ہوتی گئی اور پھر غائب ہو گئی اور چاند اب بھی کار کے ساتھ ساتھ چل رہا تھا میں نے ان کے شانے پر سر رکھ دیا اور دھیرے دھیرے گنگنانے لگی لیکن جیسے اپنی آواز خود ہی میں ہی سن رہی تھی۔"

ایرا نے ہونٹوں پر زبان پھیری میں نے اسے پانی کا گلاس دیا۔ سوچا کہ وہ ایسا نہ بولے تو اچھا ہے۔ اس کے ذہن پر بوجھ پڑ رہا ہے۔ اور جسم میں کتنی کمزوری آ گئی ہے۔

"اچھا ایرا۔ اب تم آرام کرو۔ زیادہ انرجی خرچ نہ کرو۔" میں نے کہا۔

"اوہ تم بھی میری باتوں سے بور ہو گئے۔ کوئی بھی میری بات سننا نہیں چاہتا۔"

وہ کروٹ بدل کر لیٹ گئی۔ نرس آئی اور اسے انجکشن دے کر چلی گئی۔

"نہیں یہ بات نہیں۔ میرا مطلب تم اپنے آپ کو EXHAUST نہ کرو۔ اگر تمہیں بوجھ محسوس نہ ہو تو ۔۔۔ میں تو اسی لئے آیا تھا کہ کچھ باتیں کریں گے۔ من بہل جائے گا۔" میں نے کہا۔

"تم نے کبھی سوچا کہ تم کیوں زندہ ہو؟" اس نے اچانک جیسے مجھ پر وار کیا۔

"نہیں سوچا تو نہیں۔ آخر اس میں سوچنے کی ضرورت بھی کیا ہے؟" میں بول رہا تھا لیکن جیسے میں کوئی بے معنی بات کہہ رہا تھا۔ کیسا سوال ہے؟ آخر اس کا کیا جواب ہے؟ کیا ہو سکتا ہے؟"

"پھر بھی؟"

"یونہی آخر ہم پیدا ہوئے ہیں زندہ رہنے کے لئے اور پھر موت سے آدمی کتنا ڈرتا ہے؟" میں نے کہا۔

"ہاں شاید زندہ رہنا ہماری عادت بن چکا ہے۔ اور پھر موت سے کیا ڈرنا۔ میں نے موت کو اتنے قریب سے دیکھا ہے۔ اتنے قریب سے کہ زندگی کو بھی نہیں دیکھا تھا۔ مجھے ذرا بھی ڈر محسوس نہیں ہوا۔ اور پھر موت کا ایک بار سامنا کرنے کے بعد مجھے زندگی سے دہشت ہونے لگی ہے" شاید ایرا ہذیان کی حالت میں بول رہی تھی اس لئے میں نے کوئی جواب دینا مناسب نہ سمجھا اور خاموش بیٹھا رہا۔

"میں آدی واسیوں کی طرح ننگے پاؤں گھاس پر دوڑنا چاہتی ہوں۔ میں کسی کو پکڑ کر وحشیوں کی طرح جھنجھوڑنا چاہتی ہوں" لیکن وہ تھوڑی دیر کے لئے خاموش رہی اور پھر بولی۔

"مجھے روشنی سے بڑا ڈر لگتا ہے اور اندھیرے میں سو نہیں سکتی۔ اور نیند کی

گولیوں کا کوئی اثر نہیں ہوتا۔ ہر وقت ایسا محسوس ہوتا رہتا ہے میرے ہوا کی طرح ناف سے کوئی آواز اٹھتی ہے اور پھر پھیپھڑوں میں بھر جاتی ہے۔ اور دماغ کی نسوں پر جا بیٹھتی ہے۔ بڑا بوجھ محسوس ہوتا ہے جیسے یہ آواز سارے جسم میں بھر جاتی ہے اور ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ابھی دھماکے سے سارا جسم پھٹ جائیگا اور میں بھک سے اڑ جاؤں گی۔ میں آواز کو دبانے کے لئے سونا چاہتی ہوں اور نیند کی گولیاں ـــ ذرا ایک گولی دینا اور پانی بھی ۔ " وہ ایک دم بستر پر گر جاتی ہے۔

" کمبخت ڈاکٹروں نے یہ گولیاں بھی بند کر دی ہیں معلوم نہیں ان ڈاکٹروں کو کیا مزا آتا ہے مریض کو نہ جینے دیتے ہیں اور نہ مرنے دیتے ہیں۔

اس روز کافی کی کتنی پیالیاں میں نے پی تھیں وہ تو آتے ہی بستر پر بے ہوش سے دھڑام سے گر پڑے۔ کپڑے وغیرہ بھی نہیں بدلے۔ میں بھی لیٹ گئی۔ میں بڑی تھک چکی تھی۔

سوچا جلدی نیند آجائے گی لیکن نیند جیسے بالکل غائب ہو چکی تھی سونے کی جتنی زیادہ کوشش کرتی نیند اتنی ہی دور ہوتی جا رہی تھی۔ چاند کی روشنی کھڑکی سے چھن کر میرے بستر پر تلی سی بن کر دبک گئی تھی۔ میں نے روشنی کے جسم پر ہاتھ پھیرا۔ کتنی نرم تھی وہ۔ میں باہر ٹیرس پر آگئی۔ سب گھروں کی روشنیاں بجھ چکی تھیں ہوا میں ہلکی سی خنکی تھی۔ دور دور تک سڑکوں کی روشنی کی جھالر لٹک رہی تھی۔ اور کوئی آواز نہیں تھی۔ اور چاند بہت قریب چھت پر آگیا تھا۔ روشنی اور سائے کے شہر میں چاند اکیلا تھا۔ میری خواہش ہوئی کہ لپک کر چاند کو چھپا لوں کرنیچے کمرے میں فون کی گھنٹی بجنی شروع ہو گئی۔

شاید ٹرنک کال تھی۔ اکثر رات کو ہی ٹرنک کالز آتی ہیں۔ بزنس کے سلسلے میں۔ میں دوڑ کر نیچے آئی۔ میں نے ایکدم سے رسیور اٹھایا۔ پھر نہ جانے کیا خیال آیا کہ میں نے رسیور رکھ دیا۔ یہی پانچ دس ہزار روپے کا نقصان ہی ہوگا نا۔ میرے بستر پر چاندنی اب بھی تلی سی دبک کے سو رہی تھی۔ میں بستر پر لیٹ گئی۔ میں نے انہیں

آواز دی وہ نشے میں دھت سوئے پڑے تھے۔ اور مجھے ایسا محسوس ہوا کہ وہ میرے قریب ہو کر بھی بہت دور ہیں۔ یہ فاصلہ چند قدموں کا نہیں میلوں کا ہے۔ کئی صدیوں کا ہے۔ دور سے گیدڑوں کے چیخنے کی آوازیں آنے لگیں۔ مجھے دہشت نے جیسے ایکدم جکڑ لیا۔ سچ سدی میں نے زندگی میں اتنا تنہا کبھی محسوس نہیں کیا تھا۔ میں نے سونے کی کوشش کی لیکن نیند نہیں آرہی تھی۔ میں نے نیند کی ایک گولی کھائی۔ نیند پھر بھی نہیں آئی۔ پھر دوسری پھر تیسری۔ اور پھر۔ اور پھر مجھے کچھ معلوم نہیں کیا ہوا؟۔ بس جیسے بڑا سکون مل گیا۔ سب تھکن دور ہو گئی۔ اور جب آنکھ کھلی تو اپنے کو اس نرسنگ ہوم میں پایا۔" ایرا خاموش ہو گئی۔ اس نے پانی مانگا میں نے گلاس اس کی طرف بڑھا دیا۔

معلوم نہیں مجھے اتنی پیاس کیوں محسوس ہو رہی ہے۔ پہلے تو ایسا کبھی نہیں ہوا۔ اس نے کہا۔

اس کی آواز مدھم ہو چکی تھی۔ اور وہ خاموش ہو گئی۔ انجکشن کا اثر ہو رہا تھا۔ اس پر غنودگی طاری ہو رہی تھی۔ اور وہ چند لمحوں میں گہری نیند میں چلی گئی۔

کالے گلاب کی صلیب

سلویا کے کمرے میں جاتے ہوئے مجھے عجیب سی دہشت محسوس ہونے لگی
سلویا کو پہلی بار میں نے ایک پارٹی میں دیکھا تھا پیلے پھولوں والی اسکرٹ
اور سرخ بلاوز میں وہ کتنی شوخ نظر آرہی تھی۔ ایک میز سے دوسرے میز تک
وہ خوشبو کی طرح تیر رہی تھی۔ مسرت کی لہروں پر جسم کی ناؤ ہچکولے کھا
رہی تھی۔

اور پھر اس رات کو دیکھا تھا جب میں اداس تھا اور کافی دیر تک
سڑکوں پہ بے کار گھومتا رہا اور وہ اچانک مجھے ایک کرانگ پر مل گئی شاید
وہ بھی میری طرح تنہا درد لئے بھٹک رہی تھی۔

" رکو... تمہیں گھر جانے کی جلدی تو نہیں"۔ اس نے کہا۔
"نہیں تو..." شاید اسے معلوم نہیں تھا کہ میرا کوئی گھر نہیں۔
"میں ذرا گھومنا چاہتی ہوں"۔
ہم پیدل انڈیا گیٹ کی طرف چل پڑے۔
"میں کچھ تھک گئی ہوں"۔ اس کا چہرہ پیلا اور کمزور تھا۔
میں نے اسے اپنے بازوؤں کا سہارا دینے کی کوشش کی۔
"میرا مطلب جسم کی تھکن سے نہیں"۔
میں نے اپنے ہاتھ کھینچ لئے۔
"سگریٹ پیوگے"۔ اس نے پرس سے سگریٹ نکالتے ہوئے کہا۔
"میں نے سگریٹ پینا چھوڑ دیا ہے"۔
"سانس کی شکایت ہے کیا ؟"
چاند ابھی عمارتوں کے پیچھے تھا اور بڑی بڑی عمارتوں کے سائے کشادہ سڑکوں
پر پھیل رہے تھے۔ انڈیا گیٹ پہنچ کر ہم کافی دیر تک ننگے پاؤں گھاس پر گھومتے

رہے تھے۔ نہر کے کنارے چلتے چلتے ہم دونوں کی پرچھائیاں جھلمل جھلمل کر رہی تھیں۔ ایک لمحے کے لئے میری خواہش ہوئی کہ کہیں اس کی کمر میں ہاتھ ڈال دوں۔ میں نے اس کی طرف دیکھا۔ اس نے میری آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔

"میں سمجھتی ہوں ۔۔ لیکن کیا ہماری تسکین ہو سکتی ہے۔ نہیں کبھی نہیں۔ شاید ایک لمحہ کے لئے۔ لیکن کیا ہم ایک لمحہ کے لئے بھی اپنے کو بھول سکتے ہیں۔ ڈیر۔ زندگی کی ٹریجڈی یہی ہے کہ ہم اپنی عمر سے کبھی چھوٹے ہوتے ہیں، کبھی بڑے۔ ہماری جہالت بھی ہماری دشمن ہے، ہمارا علم بھی .... کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔"

وہ جیسے کسی سے بات نہیں کر رہی تھی۔

"کبھی جی چاہتا ہے مکمل خود سپردگی کر دوں۔ اور کبھی جیسے ایک سائنس داں کی طرح زندگی کو دیکھتے چلے جائیں .... بالکل دور کھڑے ہوئے .... تمہاری خواہش ہوتی ہے کہ تم ستاروں پر کمند ڈالو اور آخرش تم مٹی کے ذرّوں پر دم توڑ دیتے ہو۔"

شاید میں اس کی باتوں کا جواب دیتا۔ لیکن وہ مجھ سے مخاطب نہیں تھی۔

"تم سوچتے ہوگے میں بڑی میچیور (METURE) ہوں۔ انٹلکچوئل، پروگریسیو، ماڈرن، میں کچھ بھی نہیں ہوں۔ کاش ہم کسی بچھڑے ہوئے جزیرے کے آدی باسی ہوتے تو شاید اتنے پریشان نہ ہوتے۔ زندگی کے سفر میں کتنے لوگ ملتے ہیں۔ اجنبی اور جانے پہچانے رشتے بنتے ہیں اور ٹوٹ جاتے ہیں۔ اور ہم محسوس کرتے ہیں کہ ہم کتنے قریب ہیں اور کتنے دور۔۔ شاید ہم ازل سے تنہا ہیں ابد تک تنہا رہیں گے ..."

"لیکن پھر بھی ہم کسی ماورائی رشتے سے ایک دوسرے سے بندھے ہوئے ہیں۔" میں نے کہا۔

"ماورائی رشتے سے یا جسم کے رشتے سے؟" وہ بڑے زور سے ہنسی اور میں پہلی بار کسی کی ہنسی سے اتنا ڈر گیا تھا۔

"کافی دیر ہو گئی ہے .... چلیں" اس نے اچانک جیسے کسی خیال سے ڈرتے

ہوئے کہا۔

ایک طرف روشنیوں کا شہر تھا۔ اور دوسری طرف جنگل کا بھیانک اندھیرا تھا۔ درختوں اور پودوں کے سائے زمین پر سو رہے تھے۔ گھاس پر چاندنی پھیلی ہوئی تھی۔ درخت بالکل گم سم کھڑے تھے۔ ہر چیز چاندنی میں ڈھلی ہوئی تھی۔ ہوا میں خشکی اور چاندنی کا غبار تحلیل تھا۔ اور مکمل سناٹا تھا اور ہمارے جسم جیسے بالکل سن ہو چکے تھے۔ ایک برق رو جھٹکے کے بعد

سلویا اپنے خوابوں کو حقیقت سمجھ کر جی رہی تھی۔ اور ایک دن جب اسے اچانک احساس ہوا کہ اس کے تصور اور حقیقت میں ایک وسیع خلیج حائل ہے اور وہ اس پر نہ اپنی باہوں کا پل باندھ سکتی ہے۔ اور نہ روح کا ڈورا تو وہ مایوس ہو گئی اور زندگی اس کے لئے ایک بے معنی، بے منزل، چھٹ پٹاہٹ کے سوا کچھ نہ رہ گئی۔ موہن لاتریک کو پولیس اسی دن پکڑ لے گئی جب سلویا نے خودکشی کی تھی۔ کتنا بے رحم اور کتنا جذباتی تھا۔ موہن لاتریک۔ میں کمرے میں اکیلا رہ گیا تھا ہمیشہ کی طرح تنہا، اس کمرے میں موہن لاتریک کی بنائی ہوئی تصویریں تھیں۔ رات کے اندھیرے میں اڑتے ہوئے پر اسرار اجنبی پرندے انسانوں اور جانوروں کے کٹے پھٹے مسخ چہرے، گہرے گھنے جنگل، اور گہری اندھیری غاریں اور صلیب کا نشان ہر چہرے پر، ہر پھول پر، ہر پرندے کے پنکھ پر۔ کمرے میں تصویریں تھیں اور سلویا کے آرائش اور زیبائش کی چیزیں تھیں۔ ادھر ادھر گری، بکھری ہوئیں۔ آرام کرسی اور چائے کی پیالیاں تھیں۔ اوندھے منہ پڑی ہوئیں۔ خون کے دھبے تھے۔ بسیاہ جمے ہوئے اور گوتم بدھ کا کانسے کا مجسمہ تھا۔ اور ٹوٹے ہوئے قد آدم آئینے میں ایک چہرہ منعکس تھا۔ جذبات سے عاری، اندھا۔ میرا یا سلویا کا یا شاید موہن لاتریک کا۔ یا سب کا ملا جلا ایک چہرہ اور میں گھبرا کر کمرے سے باہر نکل آیا۔ جب میں آخری بار اپنے کمرے میں واپس آیا تو مجھے محسوس ہوا کہ کمرے کی سب چیزیں حرکت میں ہیں۔ تصویروں کے پرندے عالم بیقراری میں دیواروں سے ٹکرا رہے تھے۔ آئینے میں موہن لاتریک اور سلویا کا اور میرا چہرہ گردش میں تھا۔ اور کونے میں

پڑا گوتم بدھ کا مجسمہ کہہ رہا تھا۔ بدھم شرنم گچھامی۔

اور پھر میں نے اپنے آپ کو عدالت کے کمرے میں پایا جہاں موہن لا تریک کٹہرے میں کھڑا تھا۔

کورٹ روم میں داخل ہوتے ہی مجھے کسی سیلاب زدہ مکان کی یاد آئی خستہ حال دیواریں۔ جا بجا اکھڑا ہوا پلستر، بوسیدہ فرش، سیلا یا، ایک پرانا شکستہ بنچ اور ایک میل خوردہ کرسی، سارے ماحول پر سیلن، میل، اور اندھیرے کا سایہ تھا۔ معلوم ہوا کہ مجسٹریٹ صاحب لنچ کے بعد تشریف لائیں گے اور ان کچھ گھنٹوں کا انتظار بغیر کچھ کئے، گھومے، سوچے کتنا اذیت ناک ہوتا ہے۔ لنچ کے بعد مجسٹریٹ صاحب تشریف لائے۔ لکڑی کے جنگلے کے پیچھے ڈائس پر وہ بیٹھ گئے۔ کٹہرے میں موہن لا تریک کھڑا تھا۔ اور فائلوں سے بھری الماری بڑے سے کلاک اور دھول سے اٹے کیلنڈر کو دیکھ رہا تھا جو دیوار کا ہی حصہ بن چکا تھا۔

مجسٹریٹ صاحب نے موہن لا تریک کو غور سے دیکھا۔ اس کا حسب نسب دریافت کیا اور کچھ کاغذی خانہ پوری کی۔ الزامات کی فہرست پڑھ کر سنائی گئی۔ موہن لا تریک نے کوئی خاص دھیان نہیں دیا۔ اس وقت میرے ذہن میں نہ معلوم کیوں بادلوں کے پیچھے اونچائی میں اڑتے ہوئے ہوائی جہاز کی تصویر گھوم رہی تھی۔ ایک دم مجسٹریٹ صاحب کی آواز نے مجھے چونکا دیا۔

"کیا آپ اقبال کرتے ہیں؟"

"جی ہاں۔" وہ چونک پڑے۔ موہن لا تریک کا وکیل رومال سے عینک صاف کرنے لگا۔

"کیا؟" اس کی آواز آئی۔ وکیل استغاثہ اس کی طرف غور سے دیکھنے لگا۔

"کیا آپ اقبال جرم کرتے ہیں؟"

"جی ہاں ... میں اقبال کرتا ہوں۔" اور وہ یوں ہی مسکرا دیا۔ مجسٹریٹ صاحب نے وکیل کی طرف دیکھا۔

"معاف کیجئے گا۔ یوں ہی کچھ یاد آ گیا۔" موہن لا تریک نے کہا۔ وکیل

صاحب نے کچھ کہنے کے لئے ہونٹ ہلائے۔ موہن لاتریک فوراً بولا۔

"آپ کیس لڑنا چاہتے ہیں لیکن مجھے کوئی دلچسپی نہیں"۔

مجسٹریٹ صاحب چند منٹوں تک کاغذ پر نظریں ٹکائے کچھ سوچتے رہے۔ استغاثے کا وکیل بحث کرتا رہا۔ ظاہر ہے جب موہن لاتریک کو کیس میں دلچسپی نہیں ہے تو اور کیسے ہو سکتی ہے۔ لاتعلقی سے تعلق پیدا نہیں ہو سکتا۔

جب ہم کورٹ روم سے باہر آئے تو وکیل صاحب نے سوال کیا۔ "یہ آپ نے کیا کیا؟ کیس تو کچھ بھی نہیں تھا آپ باعزت رہا ہو جاتے۔ خیر اب بھی کوشش کروں گا۔" موہن لاتریک نے بے تعلقی سے جواب دیا۔

"شاید آپ ٹھیک کہتے ہیں لیکن اس گرمی میں آسیب زدہ ماحول میں مجھے وحشت محسوس ہوتی ہے اور مجھ میں اتنی ہمت نہیں کہ میں بار بار اس کمرے کی زیارت کر سکوں"۔

"پتھر کا فرش، پتھر کی دیواریں اور پتھر کا بستر۔ لوہے کے دروازے اور سلاخوں والی کھڑکی اور ایک گوشت پوست کا سانس لیتا آدمی۔ کبھو کبھی کوئی سایہ سلاخوں کے باہر سے گزرتا نظر آجاتا ہے۔ اور لوہے کے دروازے کے سوراخ سے کھانا اندر آجاتا ہے اور چاروں طرف اونچی اونچی دیواریں جس کے باہر ساری دنیا تھی اور جس کے اندر سہمی ہوئی زندگی تھی۔ رات کی تنہائی میں کوئی لالٹین لئے سلاخوں میں سے اندر جھانک جاتا ہے کہ تم زندہ ہو۔ موجود ہو اور دور سے آوازیں آتی ہیں۔ جنگلا، تالا، بتی سب ٹھیک ہے۔ اور رات کے سناٹے میں وقت کی آواز دیر تک گونجتی رہتی ہے"۔

موہن لاتریک جب ملا تو اس نے کہا تھا۔

ایک دن گھومتے گھومتے میں پھر قبرستان پہنچ گیا جہاں سلویا کی قبر تھی۔ رات سرد اندھیری تھی۔ سوکھے پتے زمین پر اڑ رہے تھے۔ میرے قدموں تلے پتے کھڑکھڑانے کی آوازیں اس سناٹے میں صاف سنائی دیتی تھی۔ مجھے ایسا لگا کہ سلویا کی قبر سے ایک سایہ سا لپک

کہ سامنے پیڑ کے پیچھے چھپ گیا ہے۔ میں ٹھٹک گیا۔ پیڑ سے سایہ پھر نمودار ہوا اور سلویا کی قبر پہ پریت کی طرح چھا گیا۔ قبر پہ کالے گلاب کے پھولوں کی صلیب پڑی تھی۔ یہ کون ہے جو اتنی رات گئے سلویا کی قبر پر بھوت سا منڈلا رہا ہے۔ میں نے دیکھا وہ آدمی قبر کے پاس دو زانو بیٹھ گیا۔ اس کی چھاتی پر چاندی کی ننھی سی صلیب لٹک رہی تھی۔ لیکن تعجب کی بات یہ تھی کہ وہ سادھوؤں کے گیروے کپڑے پہنے ہوئے تھا میرے سر کے پاس سے کوئی پرندہ ایک دم اڑ گیا۔ میں سہم کر پیچھے ہٹا۔ پتے شور سے کھڑکھڑائے۔

"کون" سادھو نے یک لخت مڑ کر پکارا۔

"ایک آدمی" میں نے جواب دیا۔

میں نے غور سے سادھو کی طرف دیکھا۔ صاف کھلتا ہوا چہرہ۔ چمکتی ہوئی تیز آنکھیں۔ میرے منہ سے اچانک نکل گیا۔ موہن لاتریک!

"گورو دیو!" وہ چلایا اور مجھ سے لپٹ گیا۔ تھوڑی دیر تک ہم بالکل خاموش رہے۔

"گورو دیو۔ تم یہاں کیسے؟" اس نے پوچھا۔

"اور تم؟" میں نے کہا۔

"لیکن تم تو سقت پرگیہ ہو چکے تھے"۔ وہ بولا۔

"لیکن پرگیہ سے محروم تو نہیں ہوا؟" میں نے کہا۔

"یہ سب کیا ہے لاتریک؟" میں نے پوچھا۔

"یہ سب کیا ہے؟" وہ بولا "میں کیا ہوں؟ تم کیا ہو؟ یہ زندگی کیا ہے؟ میں کیوں زندہ ہوں؟ موت کیا ہے؟ عشق کسے کہتے ہیں؟ آدمی کیا ہے؟ روح کیا ہے؟ ایشور کہاں ہے؟ دل کی دوزخ کیا ہوتی ہے؟ جسم کی جنت کیا چیز ہے؟ زندگی نے مجھ سے کئی سوال کیے۔ اس کا کوئی جواب میرے پاس نہیں اور سوال ہیں کہ بڑھتے جاتے ہیں اور میں برسوں سے ان سوالوں کے جواب کی تلاش میں گھوم رہا ہوں"۔

اس نے گری پہنچے ہوئے سادھو کی طرح کہا۔ اس نے سلویا کی قبر سے ایک پھول اٹھایا

اور مجھے پیش کیا۔

"لیکن" میں مکمل طور پر گڑبڑا گیا۔

"تم جانتے ہو گورو دیو۔ سلویا کا آئینہ اندھا ہو گیا تھا۔" اس نے کہا۔

"یہ تم سب کیا کہہ رہے ہو لاتریک" میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔

"ایک روز اپنے شب خوابی کے لباس میں سلویا میرے پاس چلاتی ہوئی آئی تھی۔ اس کے ہاتھوں میں روج کی ڈبیا تھی اور وہ کہہ رہی تھی۔ لاتریک آئینہ یک لخت اندھا ہو گیا ہے۔ مجھے کچھ دکھائی نہیں دیتا میں نے پوچھا۔ کیوں کیا ہوا؟ وہ بولی میں اپنے چہرے کی آرائش کر رہی تھی کہ کیا دیکھتی ہوں آئینے میں ایک بہت خوبصورت پری مسکرا رہی ہے۔ اس نے مجھے اپنے پاس بلانے کا اشارہ کیا۔ میں اس کی جانب لپکی اور کیا دیکھتی ہوں کہ آئینہ اندھا ہو چکا تھا۔ اور پری غائب ہو چکی تھی پھر سلویا واپس اپنے کمرے میں لوٹ گئی۔ اور بستر پر اوندھے منہ پڑی پڑی روتی رہی"۔

موہن لاتریک کہہ رہا تھا اور میں قبرستان کے عظیم سناٹے میں خوف زدہ حیرت سے کبھی اسے دیکھتا اور کبھی سلویا کی قبر کو۔

"سلویا اپنے چہرے کی تلاش میں تھی۔ اپنے اصلی چہرے کی۔ لیکن اسے اپنا اصلی چہرہ نہیں مل رہا تھا۔ اور وہ گھنٹوں آئینے کے سامنے بیٹھی اپنے چہرے کو پہچاننے کی کوشش کرتی رہی۔ اس کی خواہش تھی کہ میں اس کا پورٹریٹ بنا دوں۔ کاش میں چہرے کی تصویر اتار سکتا"۔ موہن لاتریک نے میری آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے کہا۔

"اور یہ تمہارے گیروے کپڑے اور چھاتی پر لٹکی صلیب"۔ میں نے پوچھا۔

اس نے کہا۔

"میں نے ایک خواب دیکھا تھا۔ بڑا بھیانک خواب۔ اس رات جب سلویا نے خودکشی کر لی تھی"۔

موہن لاتریک نے مجھے اپنا خواب سنایا۔

"میں کیا دیکھتا ہوں کہ بڑے زور کا زلزلہ آیا۔ چھت کی کڑیاں چٹخ جاتی ہیں۔ اینٹیں

اور شہتیر فرش پر آگرتے ہیں۔ میں، میری تصویریں اور بدھ کا مجسمہ ملبے کے ڈھیر کے نیچے دب جاتے ہیں۔ میں زور زور سے چیختا ہوں۔ چلاتا ہوں۔ بوجھ اور درد سے کراہتا ہوں۔ لیکن کوئی میری آواز نہیں سنتا۔ میری آواز میرے ہی جسم سے ٹکرا کر واپس آجاتی ہے۔ اور دم توڑ دیتی ہے۔ مجھے بس ایسا محسوس ہوتا رہا ہے کہ میرے جسم کے اوپر پتھر کی بھاری چٹانیں ہیں اور پھر ایک آخری دھماکے کی آواز سنائی دیتی ہے۔ پھر چیخ پھر قہقہہ اور پھر جیسے سارے عالم کے کتے بھونکنے لگتے ہیں۔ اور میں ملبے کے ڈھیر کے نیچے پتھر کی بھاری چٹانوں کے نیچے دھماکے کی گونج، چیخ، قہقہے اور کتوں کے بھونکنے کی آوازوں میں گھرا سسک سسک کر دم توڑ دیتا ہوں۔ یہ مردوں کی بستی ہے جہاں ہر چیز مردہ ہے۔ سوائے جلتے ہوئے آدمی کے چہرے کو جو ہیروشیما کی چٹان پر ابھی تک منعکس ہے۔ پھر جانتے ہو کیا دیکھتا ہوں۔ میرے بالکل قریب جسم کے دائرے میں دبکی ایک سیاہ بلی بیٹھی ہوئی ہے خوف زدہ جیسے کسی اچانک حملے سے ڈر کر سمٹ کر بیٹھ گئی ہو۔ اور وہ ایکدم اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ سلویا۔ میں بے اختیار چلاتا ہوں۔ اور میرا خواب ٹوٹ جاتا ہے۔ اور تم کہاں تھے گوردیو؟"

میں نے دیکھا موہن لال تریک پسینے سے تر بتر تھا۔ جیسے واقعی دوزخ کی آگ میں سے نکل کر آیا ہو۔

ہم قبرستان سے بہت دور نکل چکے تھے۔ وہ مجھے وہاں لے گیا جہاں وہ ان دنوں پناہ گزیں تھا۔ ایک ٹوٹے پھوٹے مکان کے برآمدے میں جس کے سامنے ایک بوڑھے شیشم کا ایک درخت پہرہ دے رہا تھا

"لوگ کہتے ہیں کہ اس درخت پر بھوت بستے ہیں اور ہر رات کو اس مکان کے آنگن میں ناچتے ہیں۔" موہن لال تریک نے کہا۔

"کیا تم نے بھوت دیکھے ہیں؟" میں نے پوچھا۔

"نہیں۔" وہ بولا۔ "لیکن میں نے انہیں باتیں کرتے سنا ہے، ناچتے ہوئے، گاتے ہوئے۔ آؤ اور قریب آؤ۔ تمہیں بتاؤں۔ سنو۔"

وہ مجھے مکان کے آنگن میں لے گیا۔ اجڑا ہوا مکان جو واقعی بھوتوں کا مسکن معلوم ہوتا تھا۔ پرانی خستہ دیواریں۔ دھوئیں اور دھول سے سیاہ اور میل سے اٹا اور جگہ جگہ سے اکھڑا۔ سیلن بھرا۔ ایک کھڑکی میں اکیلا کبوتر بیٹھا تھا اور فرش پر ایک نیولا ادھر ادھر بھاگ رہا تھا۔ ایک کونے میں دو تین آدمی گانجے کے نشے میں دھت آگ تاپ رہے تھے۔ شعلوں کی لووں میں انکی لپکتی ہوئی پرچھائیاں موہن لاتریک کی تصویروں کی طرح ابھر مٹ رہی تھیں۔

بالکل خاموش، بے حرکت، جیسے بے نور بوڑھے چہرے جیسے آدم کے ساتھ ان کا جنم ہوا ہو اور یگوں یگوں سے وہ اسی طرح خاموش بے حرکت بیٹھے آگ تاپ رہے ہیں۔ آگ جو متواتر جلتی جا رہی ہے اور چہرے جو زیادہ بوڑھے ہوتے جا رہے ہیں۔ بے نور، بدشکل۔

"کچھ سنا تم نے؟" موہن لاتریک نے پوچھا۔

"نہیں یہاں تو مکمل سناٹا ہے۔" میں نے حیرت سے کہا۔

میں ہمہ تن گوش ہو گیا لیکن وہاں تو واقعی گہری خاموشی تھی۔ میں نے نفی میں سر ہلا دیا۔ موہن لاتریک زور سے ہنسا۔ بالکل پاگلوں کی ہنسی میں سہم گیا۔

سب چہرے ایک دم حرکت میں آگئے۔ جیسے تصویریں زندہ ہو گئی ہوں۔ سب آدمی اٹھ کھڑے ہوئے۔ اور الاؤ کے گرد تالیاں بجا بجا کر ناچنے لگے۔ شعلے اور سائے ایک دوسرے کو ڈسنے لگے۔ وہ زور زور سے گا رہے تھے۔

سوئی اوپر سیج پیا کی کیسے سونا ہو رے

ہے ری میں تو ....

خوف نے جیسے مجھے جکڑ لیا۔ میں تیزی سے باہر کی طرف لپکا اور تیز تیز قدموں سے بھاگنے لگا۔ جیسے میرے پیچھے ناچتے گاتے شور مچاتے بھوت دوڑتے آ رہے ہیں۔ ان کی آوازیں دور تک میرا پیچھا کرتی رہیں۔ اور پھر یہ آوازیں مدھم ہوتے ہوتے اندھیرے میں ڈوب گئیں۔ میں رک کر گہری گہری سانسیں لینے لگا۔

موہن لاتریک کے قہقہے ابھی تک میرا تعاقب کر رہے تھے۔

تین خاموش چیزیں اور ایک زرد پھول

"سماوار میں اور کوئلے ڈال دوں؟" بوڑھے سرائے والے نے پوچھا۔

ہم نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

"اس برس خوب سردی پڑے گی۔"

"ہاں کچھ آثار تو ایسے ہیں، دسمبر کے دوسرے ہفتہ ہی میں برف گرنی شروع ہو گئی ہے۔"

"پچھلے سال تو کرسمس پر پہلے روز برف پڑی تھی۔"

"تم کرسمس پر یہیں تھے۔"

"ہاں۔ کیوں؟"

"میں بھی یہاں تھا ملاقات نہیں ہوئی۔"

"ویسے تو ہر برس آتا ہوں، سردیوں میں، برف گرنے کا منظر دیکھنے، کبھی کبھی ایسا جی چاہتا ہے کہ برف میں دور تک چلتے چلیں، دھند میں ڈوبے ہوئے، جب پہچانے ہوئے چہرے اجنبی دکھائی دیں اور اجنبی چہرے نزدیک سے گزریں تو احساس ہو کہ یہ تو وہی ہیں جنہیں تم برسوں سے جانتے ہو۔"

"غلام، بیگم بادشاہ" میں نے کہا "ایک رنگ کے۔"

"ادھر تین اکٹھے ہیں۔"

"اٹھا لو۔"

اس نے پیسے سمیٹ لئے اور میز پوش کا کونہ اٹھا کر اس کے نیچے رکھ دیئے۔

تاش کے پتے پھر بٹنے لگے۔ سماوار میں پانی گرم ہو رہا تھا۔ بھاپ کے سفید سفید بادل ابھرنے لگے۔ آتشدان میں ایک لکڑی اور ڈال دی گئی۔ باہر برف بدستور گر رہی تھی۔

"تو تم ہر سال کرسمس میں آتے ہو؟"

سنا ہے کرسمس کا دن سب سے بڑا ہوتا ہے۔ اتنے لمبے دن میں اکیلے ایک کونے میں اس دور دراز سرائے میں بیٹھ کر قہوہ پینے میں بڑا مزہ آتا ہے، باہر برف گر رہی ہوتی ہے اور آدمی اپنے سے طویل ملاقات کر سکتا ہے۔ جو شاید سال بھر وہ نہیں کرتا۔ دوسرے لوگ دوسری باتیں۔ جیسے تم کچھ بھی نہیں ہو، صفر بھی نہیں، تمہارا کوئی چہرہ نہیں، تمہارا کوئی دل نہیں، تمہارا کوئی دوست نہیں۔"

"آج بجلی بڑے زوروں سے چمک رہی ہے۔"

"مجھے بجلی کے چمکنے سے بڑا ڈر لگتا ہے۔"

"پہاڑی اسٹیشنوں پر تو بجلی اکثر چمکتی ہے۔ بادل خوب گرجتے ہیں۔"

"لیکن کبھی کبھی آدمی ڈر کے قریب ہونا چاہتا ہے۔ یہ دیکھنے کے لئے کہ اس کے چہرے کا رنگ کیسے بدلتا ہے۔"

"اسی لئے تمہیں شکار پسند ہے۔"

اس نے سر ہلا دیا اور پائپ سلگانے لگا۔

سرائے والے نے قہوے کے تین پیالے میز پر رکھ دئے۔ قہوے کی سنہری رنگت سے بھاپ کی سفیدی اٹھتی ہوئی دل کو بڑا خوشگوار احساس دیتی ہے۔ لکڑی کے چٹخنے کی آواز بڑی بھلی معلوم ہوتی ہے۔ اور آگ کے شعلوں کے باعث سامنے بوسیدہ دیوار پر سائے آپس میں ٹکراسے جاتے ہیں۔

تم خاموش کیوں ہو گئے۔ میں نے پوچھا۔

سوچتا ہوں، وہ کون سی چیز ہے جو ہمیں ہر برس اس جگہ لے آتی ہے۔

سردی میں سب پرندے اپنے اپنے آشیانے چھوڑ کر گرم علاقوں میں چلے جاتے ہیں اور یہاں کے باسی بھی میدانوں میں چلے جاتے ہیں اور ہم "

"شاید ہم پر کسی شاپ کا اثر ہے"۔ تیسرا آدمی بولا۔

" ہر آدمی کو اپنا گھر چھوڑنا پڑتا ہے۔ آدم اور حوا سے لے کر ہم سب تک"۔ میں نے کہا۔

" اور جنت کو چھوڑ کر ہم اس دنیا میں مسلسل بھٹک رہے ہیں"۔

"مسلسل بھٹکنا انسان کی قسمت ہے"۔

" تم قسمت پر وشواس کرتے ہو"

"ہر آدمی قسمت پر وشواس کرتا ہے۔ تم نہیں کرتے"۔

وہ خاموش رہا۔

" تم ہر برس یہاں کیوں آتے ہو۔ کسی کی تلاش میں آتے ہیں۔ تمہیں تو قسمت ہی کھینچ کے لاتی ہے"۔

"شاید"

" تم کہتے ہو تم نے کئی بار کوشش کی ہے کہ تم اس برس یہاں نہیں آؤ گے۔ لیکن جونہی تمہیں خبر ملتی ہے کہ برف گرنا شروع ہو گئی۔ تمہارے جسم میں جیسے لاوے کی گرمی تیرنے لگتی ہے۔ اور تمہیں خبر ہی نہیں رہتی کہ تم اس سرائے میں ہو"۔

" یہ قسمت نہیں"۔

" تو اور کیا ہے؟"

وہ خاموش ہو گیا۔ تاش کے پتے اس کے ہاتھ میں لرزنے لگے۔ اس نے قہوے کا ایک گھونٹ پیا اور اپنے ساتھیوں کی طرف دیکھا۔ اور پھر پتوں کو ایک دوسرے سے بدلنے لگا۔ کمرے میں خاموشی چھا گئی۔ صرف لکڑی کے جلنے کی آواز تھی۔ یا سماوار میں پانی کھولنے کی۔ اس کے چہرے پر ہلکی سی سیاہی چھا گئی۔ اس نے اپنی کرسی آتشدان کے قریب سرکائی۔

"آج میں نے مس فریڈا کو دیکھا ہے"۔ تیسرا آدمی بولا۔

"کہاں؟" میں نے پوچھا۔

"راج پر، وہ اکیلی ہی جا رہی تھی، اس نے بالوں میں ایک ننھا سا زرد پھول لگا رکھا تھا۔"

"یہ مس فریڈا سردیوں میں چلی کیوں نہیں جاتی۔ ڈانس اسکول تو بند ہو جاتا ہے۔ اور ٹورسٹ بھی نہیں ہوتے۔ کاروبار بڑا مندہ ہوتا ہے"۔

"سنا ہے اس کے اپنے اسکول کے پروپرائٹر سے کئی بار جھگڑا ہو چکا ہے"۔

"کیوں؟"

"وہ چاہتا ہے کہ جس سے وہ چاہے فریڈا اس کے ساتھ رقص کرے۔ اس کے ساتھ شراب پیئے۔ اس کے ساتھ اور اس کے ساتھ۔"

"تو اس میں کیا ہے۔ آخر وہ دوسروں کے ساتھ بھی تو گھومتی پھرتی ہے"۔

"وہ کہتی ہے کہ میں اسکول سے باہر آزاد ہوں، جہاں چاہوں گھوموں، جس سے چاہوں ملوں۔" تم نے کبھی فریڈا کے ساتھ ڈانس کیا ہے"۔

"نہیں"۔

"اس کے ساتھ رقص کرتے ہوئے محسوس ہوتا ہے کہ تم قوس قزح پر جھول رہے ہو، اس کے جسم کی حدت، خوشبو اور رنگ تمہیں مدہوش بنا دیتے ہیں"۔

"کس کا ذکر کر رہے ہو"۔ فریڈا کا"۔ آتشدان کے قریب سے اٹھ کر وہ دائیں میز پر آ گیا۔

"تین برس ہوئے ایک رات، وہ اس سرائے میں آئی تھی۔" اس نے کہا۔

"اس سرائے میں"۔ میں نے حیرانی سے پوچھا۔

"اس نے ہلکے سرخ اور پیلے پھولوں والی اسکرٹ پہن رکھی تھی۔ اور لال بلاؤز، اس کے بال ہواؤں میں لہرا رہے تھے اور گلے میں نیلا اسکارف تھا۔ جس پر روم کے گرجا گھروں کی تصویریں بنی ہوئی تھیں۔ اس کا چہرہ برف کی طرح سفید

تھا۔ اس نیم تاریک کمرے میں شعلوں کے سامنے وہ انتہائی خوبصورت لگ رہی تھی وہ بے حد پئے ہوئے تھی۔"

"پھر کیا ہوا۔"

"میں نے اسے کرسی پر بیٹھا دیا۔ اسی کرسی پر جس پر تم بیٹھے ہو۔ وہ کرسی کی پشت پر سر ٹیک کر بیٹھ گئی۔ میں اس کے اوپر جھک گیا۔ میں نے پوچھا میں تمہاری کیا مدد کر سکتا ہوں۔ اس نے اپنی آنکھیں کھولیں، میری طرف دیکھا اور مسکرا دی۔"

"تم کیا مدد کر سکتے ہو۔"

"کچھ بھی۔"

"میرے جسم کو مت چھونا۔ بس اس نے کہا اور آنکھیں بند کر لیں۔ میں اس کے سامنے کرسی پر بیٹھ گیا۔ اس نے اپنے ہینڈ بیگ سے وہسکی کی شیشی نکالی اور منہ سے لگالی۔ میں نے اس کے ہاتھ سے شیشی چھیننی چاہی۔ وہ پہلے ہی پئے ہوئے تھی۔ اس نے میرا ہاتھ جھٹک دیا۔ تم نے وعدہ کیا ہے تم میرے جسم کو نہیں چھوؤ گے میں واپس کرسی پر بیٹھ گیا۔ وہ اسی طرح کرسی کی پشت پر سر ٹکائے نیم دراز رہی اور پھر سو گئی۔ میں نے اپنا اوور کوٹ اس پر ڈال دیا۔ مجھے نیند نہیں آ رہی تھی۔ بس فریڈا سے یہ میری پہلی ملاقات تھی۔"

میں فریڈا کی داستان بڑے شوق سے سن رہا تھا۔ سرائے والا پیالوں میں اور قہوہ ڈال گیا۔

"جب وہ صبح اٹھی اس نے انگڑائی لی اور چاروں طرف دیکھا۔ میں کہاں ہوں؟"

اس نے پوچھا۔"

"سرائے میں۔"

"کون سی سرائے میں۔ اوہ ڈرٹی لٹل ران۔"

"تم ٹھیک ہو نا۔" میں نے پوچھا۔

"تم کون ہو؟"۔

"میں کون ہوں اس سے کیا فرق پڑتا ہے؟"

وہ ایک لمحے کے لئے خاموش رہی پھر اس نے اپنا اسکارف ڈھیلا کیا۔ اس کے بالوں کا پھول فرش پر گر گیا۔

"تم یہ زرد پھول کیوں لگاتی ہو" میں نے پوچھا۔

"آج پہلی بار لگایا ہے۔ نہ جانے کیوں جی چاہا، اس نے میری طرف دیکھا۔ برف گرنے سے پھول زرد ہو جاتے ہیں۔" اس نے کہا اور آنکھیں بند کرلیں۔

"میں تمہیں کیسی لگتی ہوں"۔ وہ اچانک بولی۔

"بہت خوبصورت، جاذب اور ۔"

"اور کیا۔" اس نے پوچھا۔

جو میرے ذہن میں تھا۔ وہ میں کہہ نہیں سکا۔ وہ مسکرادی اگر تم نے وعدہ نہ کیا ہوتا کہ میرے جسم کو نہیں چھوؤ گے تو مجھے مدہوش پاکر تم کیا کرتے"۔ میرے پاس اس کے سوال کا کوئی جواب نہیں تھا۔ شاید وہ جواب چاہتی بھی نہیں تھی۔

"اگر میں نیلام ہونا چاہوں تو میری قیمت کیا ہوگی؟" میرا مطلب ہے ایک رات کی نہیں۔ جب تک میں زندہ رہوں۔ چھوڑو، اگر تم خریدنا چاہو تو کیا دو گے۔ شاید تمہارے پاس اتنے پیسے نہیں۔ تم ایک رات کا کیا دو گے"۔ وہ مسلسل بولے جا رہی تھی۔

"میں تمہیں خرید نہیں سکتا میڈم۔ انسان کی کوئی قیمت نہیں۔"

"یو ڈیم ہپو کریٹ۔"

میں خاموش رہا۔

"تم، مجھے کیپ بنانا چاہتے ہو۔"

"نہیں۔"

"تم نے کبھی پیار کیا ہے۔"

"نہیں۔ شاید تم نے بھی کبھی محبت نہیں کی۔"

کوئی آدمی کسی سے پیار نہیں کرتا۔ سب اپنے تصور سے پیار کرتے ہیں اور جب یہ تصور ٹوٹ جاتا ہے تو وہ مایوس ہو جاتے ہیں۔ کچھ بے وفا ہو جاتے ہیں۔ کچھ خودکشی کر لیتے ہیں۔ پھر اور کچھ دوسروں سے شادی کر لیتے ہیں۔"

"پیار نہ تصوّر سے ہوتا ہے نہ جسم سے بلکہ شخصیت سے، جسم سے، دل سے، روح سے۔" "یہ روح کیا ہوتی ہے۔ کتابوں میں اس کا بڑا ذکر آتا ہے"۔ وہ بولی "جسم ہی حقیقت ہے، جسم سے پرے کوئی سچائی نہیں"۔ فرش پر اس کے پاؤں تھرکنے لگے اور اس کا جسم گلاب کے پھولوں کی طرح کھل اٹھا۔ وہ ہلکے ہلکے سروں میں گنگنانے لگی۔

تین خاموش چیزیں۔
گرتی ہوئی برف۔
پو پھٹنے سے پہلے کا لمحہ
اس کا چہرہ۔
جس کی موت ابھی ہوئی ہے۔

گاتے گاتے اس کے قدم ایک دم رک گئے۔ اس کا چہرہ سفید پڑ گیا۔ اور وہ بے حس سی کرسی پر گر پڑی۔ اس نے فرش سے پھول اٹھایا اور اپنے بالوں میں لگایا۔ میں نے قہوے کا پیالہ بنایا اور اسے پیش کیا۔ اس نے قہوہ پیا اور چلی گئی۔

باہر برف گر رہی تھی۔ پو پھٹنے ہی والی تھی۔ میں نے کھڑکی کے شیشے سے دیکھا۔ وہ دھیرے دھیرے جا رہی تھی۔

پھر وہی مس فریڈا تھی۔ وہی ڈانس اسکول، وہی باہوں کے ہالے اور آغوش کے غار اور جسم شراب میں ڈوبے ہوئے۔"

اس نے تاش کو میز پر رکھتے ہوئے کہا اور قہوے کا ایک گھونٹ پیا۔ آتشدان میں آگ دھیمی پڑ چکی تھی۔ سماوار میں پانی کھول کھول کر خاموش ہو چکا تھا۔ بوڑھا سرائے والا اپنی چارپائی پر اونگھ رہا تھا۔ ہوا کے جھونکے سے لیمپ ہل رہا تھا۔ اور ہمارے سائے فرش اور دیوار پر کانپ رہے تھے۔ وہ کرسی سے اٹھا اور کھڑکی کے

قریب جا کھڑا ہوا۔ اچانک کھڑکی کھلی اور ہوا کے تیز جھونکے اندر آنے لگے تاش کے پتّے میز پر سے اڑ کر سارے کمرے میں بکھر گئے۔ بوڑھے سرائے والے نے اپنی آدھی بند آنکھیں کھولیں اور لحاف منہ پر اوڑھ کر سو گیا۔ میں نے لپک کر کھڑکی بند کر دی۔ چیڑ کے درختوں سے گزرتی ہوئی ہوا کا شور اب بھی کمرے میں آ رہا تھا۔

"آج طوفان بہت تیز ہے۔ بجلی چمک رہی ہے"۔ میں نے کہا۔

بجلی کے چمکنے سے کمرے میں یکبارگی روشنی کی لہر پھیل کر سمٹ گئی۔ وہ کھڑکی سے ہٹ آیا۔

"تم نے کہا تھا فریڈا نے آج بھی زرد پھول لگا رکھا تھا؟" اس نے اچانک پوچھا۔

"ہاں"۔ تیسرے آدمی نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

اس نے پائپ سلگایا اور آرام کرسی پر بیٹھ گیا۔ وہ کافی دیر تک پائپ پیتا رہا میں سو گیا۔

ابھی صبح نہیں ہوتی تھی۔ سرائے والا میرے سرہانے کھڑا مجھے جگا رہا تھا۔

"صاحب غضب ہو گیا۔ وہ صاحب جو ہر سال یہاں آتے ہیں نہ جانے کہاں چلے گئے ہیں۔ باہر بڑا طوفان ہے صاحب"

میں ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ میں نے سامنے اس کی چارپائی پر دیکھا۔ وہ نہیں تھا۔ میز پر اس کا پائپ پڑا تھا۔ میں نے جلدی سے کوٹ پہنا اور باہر کی طرف لپکا۔

برف بدستور گر رہی تھی۔ پو پھٹنے ہی والی تھی۔ سڑک بہت نیچے گلین کی طرف جا رہی تھی۔ وہ اکثر اسی سڑک پر جایا کرتا تھا۔ کافی دور جانے کے بعد مجھے کسی کی جھلک دکھائی دی۔ میں جلدی سے اس کے قریب پہنچا۔ وہ وہی تھا۔ وہ ایک یخ بستہ آدمی کی طرح ساکت کھڑا تھا اور نیچے دیکھ رہا تھا۔ اچانک میری نگاہ نیچے پڑی میں مبہوت رہ گیا۔ سڑک پر برف سے ڈھکی مس فریڈا کی لاش پڑی تھی۔

سیاہ تل

دروازے پر دو بار دستک ہوئی
میں نے دروازہ کھولا۔
باہر وہ کھڑا تھا اسے میں نہیں جانتا تھا۔
"پہچانا مجھے ۔۔۔" اس نے سوال کیا۔
"نہیں شاید!" مجھے یاد نہیں آرہا تھا کہ وہ کون ہے، اسے کہاں دیکھا تھا۔ شاید اسے میں نے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔
"شملے میں ہماری ملاقات ہوئی تھی"۔ اس نے کہا "اس روز بارش بڑے زوروں کی تھی اور ہم ایک سرائے میں پناہ لینے پر مجبور ہو گئے تھے۔"
"ہاں ہاں" میں نے کہا۔ لیکن مجھے کچھ یاد نہیں آرہا تھا۔
"اندر آئیے"۔ میں نے کہا۔
وہ اندر آگیا، اور آرام کرسی پر بیٹھ گیا۔ اس نے جیب سے پائپ نکالا اور دھیرے دھیرے اس میں تمباکو ڈالا۔ اس نے اپنی جیب میں ماچس تلاش کی۔ لیکن اس کے پاس ماچس نہیں تھی۔ میں نے اسے سگریٹ لائٹر پیش کیا۔
"شکریہ!" اس نے کہا۔ "جب ہم شملے میں ملے تو تمہارے ساتھ ایک لڑکی تھی۔"
"لڑکی۔؟" میں نے جیسے چونکتے ہوئے کہا۔ مجھے نہ جانے کیوں یہ خیال آیا کہ شاید یہ آدمی مجھے بلیک میل کرنا چاہتا ہے۔ اس کی شکل وصورت اور نقل وحرکت

سے مجھے یہی شک گزرا۔"

"اب تمہاری یادداشت کافی کمزور ہو گئی ہے۔" وہ بولا۔ اس کے لہجے میں طنز تھا۔

"یاد کرو۔ ذہن پر ذرا زور ڈالو۔ ایک سانولے رنگ کی چھریرے بدن والی لڑکی ۔۔ اور ۔۔۔" وہ اچانک خاموش ہو گیا۔

اب میں کس کس لڑکی کو یاد کروں۔ سانولے رنگ چھریرے بدن والی لڑکی۔

"کوئی بات نہیں اور نشانی بتاتا ہوں ۔۔ اس کی گردن پر بائیں جانب ایک سیاہ تل بھی تھا۔" اس نے کہا۔

اب مجھے پورا یقین ہو گیا کہ وہ مجھے بلیک میل کرنا چاہتا ہے۔ وہ اس لڑکی کا ذکر اس انداز سے کر رہا تھا جیسے وہ اسے بہت ہی قریب سے جانتا ہے اور مجھے دھیرے دھیرے اپنے جال میں پھانس رہا ہے۔

میں نے صاف انکار کر دیا۔

اس نے جیب سے کاغذ کا ایک ٹکڑا نکالا ۔۔ "اسے پہچانتے ہو؟" اب اس کی نگاہیں میرے چہرے پر گڑ گئی تھیں۔

اخبار کے اس پرزے پر ایک لڑکی کی تصویر تھی۔ یہ کپڑوں کی کسی فرم کا اشتہار تھا۔

"ہاں! میں نے اسے مختلف قسم کے اشتہاروں میں کئی بار دیکھا ہے۔ شاید یہ ماڈل گرل ہے ۔۔" میں نے کہا۔

لیکن میں نے اسے پہچان لیا تھا۔ یہ سونیا تھی۔

"تم اس لڑکی کو کیسے جانتے ہو؟" میں نے اس سے سوال کیا۔ میرا لہجہ جارحانہ تھا۔

"یہ نیچے بہت مہین حروف میں یہ نام پڑھ رہے ہو ۔۔۔ میں اس ایڈورٹائزنگ فرم کا منیجر ہوں۔"

"اوہ!" میں نے سر ہلایا۔

"اس لڑکی کے خدوخال، نقوش اور چہرے میں ایک خاص قسم کا توازن ہے۔ میرے پسندیدہ ماڈلوں میں یہ سب سے زیادہ چارمنگ ہے۔" اس نے پائپ کا ایک لمبا کش لیتے ہوئے کہا۔ وہ آرام کرسی کی بیک پر جھک گیا۔

"میں نے سینکڑوں اشتہار ڈیزائن کئے ہیں۔ اور بیشتر اشتہاروں میں اس لڑکی نے ماڈل کیا ہے ۔۔۔ ایک روز ۔۔۔ اچانک میری نظر اس کی گردن کے سیاہ تل پر پڑ گئی۔ اس سے پیشتر بھی میں نے یہ تل دیکھا تھا۔ لیکن اس روز اسٹوڈیو کی روشنی کچھ اس زاویے سے اس تل پر پڑی کہ یہ تل جیسے اس کی شخصیت کا مرکزی نقطہ بن کر چمک اٹھا۔"

"لیکن ان سب باتوں کا مجھ سے کیا تعلق ہے؟" میں نے کہا۔

"دراصل ان سب باتوں کا مجھ سے بھی کوئی تعلق نہیں"۔ وہ بولا۔ "اس لئے کہ میں ایک پروفیشنل ہوں۔" وہ تھوڑی دیر کے لئے رکا۔ پھر بولا ۔۔۔ "اور میرا خیال تھا کہ میں محض ایک پروفیشنل ہوں۔ لیکن میں اس لمحے کو کبھی نہیں بھولوں گا جب مجھے اچانک یہ محسوس ہوا کہ میں آدمی بھی ہوں۔ میری زندگی میں کئی ماڈل آئے۔ لیکن کسی نے مجھے یہ احساس نہیں دیا کہ میں آدمی بھی ہوں۔ نرا پروفیشنل ہی نہیں۔ تم جانتے ہو نا ایڈورٹائزر کا کام چیز بیچنا نہیں ہوتا۔ چیز کے تصور کی اشاعت کرنا ہے۔"

"تم کہہ رہے تھے کہ اس کی گردن پر سیاہ تل تھا۔" میں نے اسے ٹوکا میں اس آدمی سے جلد از جلد چھٹکارا حاصل کرنا چاہتا تھا۔ میرے ذہن میں سونیا کی تصویر ایک FLASH کے ساتھ ابھری۔ سونیا کی گردن پر سیاہ تل کتنا خوبصورت معلوم ہوتا تھا۔ شاید اس کی کشش کا تمام تر راز اسی تل میں تھا۔ میرے پیار کی شدت کا اظہار بھی اس کے تل کا لمس تھا۔ لیکن سونیا بڑی ضدی لڑکی تھی۔ میں نے اس سے کئی بار کہا کہ تم یہ ماڈلنگ چھوڑ دو۔ مجھے تمہارے جسم

کی یہ عجیب و غریب زاویوں میں اور کبھی کبھی نیم برہنگی کی حالت میں نمائش پسند نہیں.
لیکن ہر بار اس کا یہی جواب ہوتا کہ خوبصورتی کو گناہ کے تصوّر سے ملوث نہ کرو.

"چلو اٹھو ــــ میرے ساتھ چلو" اس آدمی نے اچانک کہا.

"کہاں ـ؟" میں نے پوچھا.

"جہاں میں لے جاؤں"

"پھر بھی"

"میں نے کہدیا نا! چلو میرے ساتھ ــــ" اس کی آواز میں درشتی تھی.

میں جس حالت میں تھا اس کے ساتھ چل دیا. مارکیٹ سے ہوتے ہوئے ہم بڑی سڑک پر آگئے. رات کے قریب گیارہ بجے تھے. سڑکوں پر ٹریفک خال خال ہی نظر آتی تھی. بڑی سڑک سے ہٹ کر ہم ایک تنگ سڑک پر آگئے.

"تم مجھے کہاں لئے جارہے ہو؟" میں نے پوچھا.

اس نے کوئی جواب نہیں دیا. راستے بھر وہ خاموش چلتا رہا جیسے پستول کی نالی کی زد پر وہ مجھے کسی خفیہ مقام پر لئے جارہا ہو. اب قبرستان کی چہار دیواری شروع ہوچکی تھی. گیٹ پر آکر وہ تھوڑی دیر کے لئے رکا اور پھر اس کے اندر داخل ہوگیا.

"قبرستان میں کہاں لئے جارہے ہو ـ اتنی رات گئے ــــ؟" میں نے کہا.

اس نے پھر بھی کوئی جواب نہیں دیا. چند قدم چل کر وہ ایک قبر کے پاس رک گیا. وہ قبر پر دوزانو بیٹھ گیا. اور اپنے سینے پر صلیب کا نشان بنایا. میں بھی دوزانو بیٹھ گیا اور اس کی پیروی کرنے لگا.

چند منٹ وہ خاموش رہا. چرچ کی گھڑی نے شاید بارہ بجائے. وہ اٹھ کھڑا ہوا. جیب سے ٹارچ نکالی اور قبر پر ایستادہ پتھر پر روشنی ڈالی.

"سونیا ــــ" میں چلّایا.

قبر پر لکھا تھا ـ "سونیا ــــ ۱۹۵۰ ــــ ۱۹۷۰"

"کیا سونیا مر گئی ؟" میں نے آہستہ سے کہا۔ حالانکہ یہ سوال بڑا بے محل تھا۔

"ہاں ۔ میں نے سونیا کو مار دیا ہے" وہ بڑی نرمی سے بولا۔

یہ آدمی اس آدمی سے مختلف تھا جو مجھے یہاں تک لایا تھا۔

"تم ۔ تم نے سونیا کا قتل کیا ہے ؟ ظالم ۔ گناہ گار ۔۔" میں نے کہا۔

" اور تم نے بھی ۔ ہم دونوں سونیا کے قاتل ہیں"۔

وہ تھوڑی دیر خاموش رہا ۔ "چلو۔ واپس چلیں"۔ اور اس نے میرا بازو تھام لیا ۔ اور کہنے لگا ۔

" ایک دن میں سونیا کی تصویریں لے رہا تھا ۔ نیل پالش کے ایک بڑے PRESTIGE اشتہار کے لئے ۔۔۔ اس کی لمبی لمبی انگلیاں تھیں کیڑوں پر حرکت کر رہی تھیں ۔ گٹار کے تاروں پر لرز رہی تھیں ۔ اور میں تصویریں لئے جا رہا تھا ۔ اچانک اس نے اپنی انگلیاں اپنی گردن پر رکھ لیں ۔ بالکل وہیں جہاں اس کی گردن پر سیاہ تل تھا ۔ اور اس نے ایک لمبی سانس لی ۔ اتنا مسحور کن چہرہ ، اتنی پرکشش ادا میں نے زندگی بھر نہیں دیکھی تھی پلینرویٹ ۔ جسٹ اے منٹ ۔ ون شاٹ اینڈ دیٹ از ڈن

" تو باس ! تم اس تل کی تصویر نہیں لے سکتے ۔ یہ اشتہار کے لئے نہیں" اس نے کہا ! میں نے بڑا اصرار کیا لیکن اس نے انکار کر دیا ۔" اس سے میری کئی یادیں وابستہ ہیں ۔ یہ میرا عزیز ترین سرمایہ ہے "۔ اس نے کہا تھا ۔ غصے میں آ کر میں نے اس کا کنٹریکٹ کینسل کر دیا ۔ اس نے کنٹریکٹ کی خلاف ورزی کی تھی ۔ میں نے کہا ۔

" میں تمہارا کیریئر برباد کر دوں گا "۔

اس نے کہا " بے شک "۔

اور میں نے واقعی اس کا کیریئر برباد کر دیا ۔ عدالت نے اس کے خلاف فیصلہ دیا ۔ اسے ہرجانہ دینا تھا ۔ یا دوسری صورت میں اسے میری مرضی کے مطابق تصویر

کھنچوانی پڑتی ـــ" ہر جانے سے پیسے اس کے پاس تھے نہیں ـ لہٰذا . . ."

"پھر؟" پھر اس کی تصویر جیسا کہ میں نے چاہا لے لی ـ وہ اشتہار شاہکار ثابت ہوا ـــ سونیا کو پہلے سے زیادہ کنٹریکٹ ملتے گئے۔ لیکن ـ"

"لیکن ـــ؟" میں نے پوچھا۔

"اس کے بعد سونیا کی کوئی تصویر نہیں چھپی۔ اچانک اس نے تمام کنٹریکٹ کینسل کر دئے تھے۔"

"لیکن؟" میرے سوال کا جواب ابھی نہیں ملا۔

"لیکن کیا؟ اس تصویر کے بعد اس نے انہیں انگلیوں سے اپنی جان لے لی۔ جو انگلیاں ـــ" اور اس نے ایک تصویر میرے ہاتھ میں دیدی۔

یہ سونیا کی تصویر تھی ـ گردن کے سیاہ تل پر لمبی لمبی چمکتے ناخنوں والی انگلیوں کے نرم لمس تھے ـــ

لیکن کیا سونیا واقعی محض ایک پروفیشنل ماڈل تھی ـ میرے دل نے جیسے مجھ سے سوال کیا ـ

"میں سونیا کو جانتا ہوں ـ بہت قریب سے۔" میں نے اعتراف کیا۔ "میں نے سونیا کو قتل کیا ہے۔"

وہ کچھ نہیں بولا ـــ ہم قبرستان سے باہر نکل چکے تھے۔ سڑکیں اسی طرح نا آسودہ باہوں کی طرح دور تک پھیلتی چلی جا رہی تھیں ـ اور ہم دونوں موٹی دھار کی طرح اس پر بہتے چلے جا رہے تھے ـــ جہاں لہو ریت میں جذب ہو جاتا ہے۔

پرانی تصویر نئے رنگ

ٹن، رات کے گیارہ بجتے ہیں۔ سامنے مکان کا در کھلتا ہے، اور دو آنکھیں باہر جھانکتی ہیں۔ میں بجلی کے کھمبے تلے ایک لمحے کے لئے رکتا ہوں اور پھر آگے بڑھ جاتا ہوں۔ ایک رات، دو راتیں، تین راتیں، اس طرح کتنی راتیں بیت گئیں، ٹن، رات کے ساڑھے گیارہ بجتے ہیں، سامنے مکان کا در کھلتا ہے، دو آنکھیں باہر جھانکتی ہیں، میں بجلی کے کھمبے تلے ایک لمحے کے لئے رکتا ہوں اور پھر آگے بڑھ جاتا ہوں۔ اور اس ایک لمحے میں وقت کی رفتار جیسے ٹھٹک کے تھم جاتی ہے۔

جب میں پہلی بار اس راستے سے گزرا تھا تو دور پیلے مکان کے پیچھے چاند نمودار ہو رہا تھا۔ اور مکان کے سائے ریمبران کی تصویروں کی طرح گلی، فٹ پاتھ اور سڑک پر پھیلے ہوتے تھے۔ سامنے والے مکان کی دائیں طرف، شیشم کا درخت سر جھکائے خاموش کھڑا تھا۔ جیسے کسی گہرے سکوت کی آواز سن رہا ہو۔ اور نہ بجلی کا کھمبا ادپر ہی اوپر اٹھتا چلا جا رہا تھا۔ خاموشی، تنہائی اور اندھیرا، سب دروازے اپنے اندر غم اور خوشیاں سمیٹ کر بند ہو چکے تھے۔ دروازہ دھیرے سے کھلتا ہے خاموشی کی صدا بن کر، اندھیرے میں کرن پھوٹتی ہے اور تنہائی کے سوز میں ساز بجتا ہے۔

وسو بجے تم آگئے، سائے اور روشنی ایک دوسرے میں پیوست ہو جاتے ہیں۔ اور نوجوان مرد نے کوٹ رائے کی بھوری پتلون اور کھلے کالر والی سرخ قمیص پہن رکھی ہے۔ اس کے پاؤں میں چپل ہے اور سر کے بڑھے ہوئے بال بے ترتیبی سے سنورے ہوئے ہیں۔ اس کی آنکھیں چھوٹی چھوٹی مگر تیز ہیں جیسے پارہ چمک رہا ہو۔

وہ لڑکی کی پیشانی چوم لیتا ہے۔ لڑکی نے ہلکے نیلے رنگ کی ساڑھی پہنی ہوئی ہے اس کے سیاہ کھلے رنگ بال شانوں پر بکھرے ہوئے ہیں۔ لڑکی خوبصورت حسین جاذب توجہ ہے۔ انہوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور مسکرا دیئے۔

"شیل" نوجوان نے دھیرے سے کہا اور اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ وہ دیوار کے سائے میں کھڑے ہو گئے۔ رات کتنی حسین ہے۔ شیل نے کہا۔ ہر رات حسین ہوتی ہے جب حسن۔

شیل کے رخساروں پر حیا کی سرخی دوڑ گئی۔ اس نے اپنی لمبی لمبی پلکیں جھکا لیں۔ دیوار کا سایہ پیچھے سرک گیا۔ اور چاند کی روشنی آگے بڑھ گئی۔

"بہت دنوں بعد آئے ہو۔ شیل نے نوجوان کی قمیض کے کالر کی شکن درست کرتے ہوئے کہا۔

"تمہاری تصویر بنا رہا تھا۔"

"ہوں دیکھو کتنے دبلے ہو گئے ہو۔ کبھی آئینہ دیکھا؟"

"آئینہ دیکھنے کی کسے فرصت ہے اور آئینہ تو صرف چہرے کا روپ دکھاتا ہے۔"

اس نے دونوں ہاتھوں سے شیل کا چہرہ اوپر اٹھا لیا۔

"میرے پاؤں میں خرابی ہے نا اس لئے میں اپنے پاؤں پر کھڑا نہیں ہو سکتا" نوجوان مسکرایا۔ میں نے نوجوان کے پاؤں کی طرف دیکھا۔ مجھے کوئی خرابی نظر نہیں آئی۔

"آؤ۔ کچھ باتیں، لمحے جو وقت کی رفتار سے چرائے ہیں۔ انہیں اپنے پیار سے بھر لیں" اور نوجوان نے شیل کے ہونٹوں کو چھو لیا۔

"ایسے معلوم ہوتا ہے جیسے موم سے تراشے گئے ہوں۔ میں آج کل موم کی مورتیاں بنا رہا ہوں۔" نوجوان نے اس کے ہونٹوں کے کناروں کو اپنی لمبی لمبی انگلیوں سے چھو کر کہا۔ شیل نے اس کے سینے پر سر رکھ کر آنکھیں بند کر لیں۔

"سوبھ"۔ مجھے کبھی کبھی ایسا معلوم ہوتا ہے۔
"غم نہ کرو شیل، سوبھ نے اسے سینے سے لگالیا" انسان اس حقیقت سے زندہ نہیں رہتا جسے اس نے پالیا ہے۔ بلکہ اس تصویر سے جسے وہ حقیقت کا روپ دینے کے لئے روشنی اور سائے کا سنگم پر رکنا ہے اور وقت کے رک جانے کے انتظار کا کرب برداشت کر رہا ہے۔

روشنی اور سائے کے سنگم پر وقت کے رک جانے کے انتظار کا کرب میں نے وجید اور شیل طرف دیکھا شیل کی آنکھوں میں آنسو تھے اور سوبھ کے چہرے پر فکر کی لکیریں اور ایک سمٹتی ہوئی پرچھائیں کی طرح اندھیرے میں گم ہو گئے۔ وہاں کوئی نہیں تھا۔ شیل۔ سوبھ شاید پھر سائے بن کر زمین میں جذب ہو گئے تھے یا شاید روشنی میں تحلیل ہو گئے تھے۔ یہ خواب تھا یا حقیقت یا محض ایک تصویر جو دل کے نہاں خانے میں حقیقت بننے کیلئے تڑپ رہی ہے۔ میں تھوڑی دیر بجلی کے کھمبے کے ساتھ لگ کر کھڑا رہا اور اس پر اپنے ہونٹ رکھ دئے۔ بڑے خوش نصیب ہو دوست میں نے کھمبے سے کہا اور چلا آیا۔
اس بات کو کئی دن بیت گئے۔ میں اس راستے سے کئی بار گزرا، لیکن وقت کی رفتار سے چرائے ہوتے ان لمحوں میں اپنے پاؤں کی آہٹ شامل کر کے انہیں ڈرانا نہیں چاہتا تھا۔ اس لئے آگے بڑھ جاتا تھا۔
ہاں کبھی کبھی بجلی کے کھمبے کو چوم لیتے کو اب تو رمل خواہش کو نہیں روک سکتا
ایک رات بارش نے مجھے راستے میں گھیر لیا۔ میں لپک کر بغل والے ریسٹوران میں داخل ہو گیا۔ اس ریستوران میں وہی لوگ آتے ہیں جن کے سینے حسرتوں کے مدفن ہیں۔ معلوم نہیں اس ریستوران میں وہ کون سی قوت تھی۔ جو ہر غم کو اپنے اندر جذب کر لیتی تھی۔ میں نے چائے کا آرڈر دیا اور اپنے خیالوں میں کھو گیا۔ اتنے میں کسی کے قدموں کی آواز آئی بالکونی سے ایک مرد اور عورت سیڑھیاں اتر رہے تھے۔ مرد کے بال الجھے ہوئے تھے۔ اس کے کپڑے شکن آلود تھے۔ اور اس کی چھوٹی

چھوٹی آنکھیں بند ہو رہی تھیں۔ اس کے ہاتھ میں سگریٹ کا آخری حصہ تھا اسے دیکھ کر ایسا احساس ہوتا تھا کہ وہ دن بھر آندھی میں کھڑا رہا ہے اور اب اچانک کمرے میں آ گیا ہے۔ عورت نے سرخ بھڑکیلی ساڑھی اور لو کٹ سیاہ بلاؤز پہن رکھا تھا۔ اس کے چہرے پر سرخی اور غازہ اس طرح بکھرے ہوئے تھے جیسے برش صاف کرنے والے کپڑے پر رنگ کے دھبے ہوتے ہیں۔ عورت کے لباس کو دیکھ کر مجھے برہنگی کا احساس ہوتا تھا۔

وہ میرے سامنے والی میز پر بیٹھ گئے۔ مرد نے دو پیگ کا آرڈر دیا اور میز پر سر رکھ کر بیٹھ گیا۔ عورت بے حجاب نظروں سے چاروں طرف دیکھ رہی تھی۔ میز پر گلاس رکھنے کی آواز سے وہ چونکا اس نے سر اٹھایا اور سگریٹ سلگایا، پہلی بار میں نے اس کے چہرے کی طرف غور سے دیکھا اس کے چہرے کے نقوش جانے پہچانے سے معلوم ہوتے۔ پارے کی طرح حرکت کرتی چھوٹی چھوٹی تیز آنکھیں میں نے یاد کرنے کی کوشش کی کہ اسے کہاں دیکھا ہے۔ اوہ یہ تو سوجھ ہے۔

اس شکستہ حالت میں، اسے کیا ہو گیا؟

یہ ساتھ کون ہے؟ یہ شیل تو نہیں۔ کوئی فاحشہ نظر آتی ہے۔ میں نے اس عورت کی طرف دیکھا وہ ہنس دی۔ سوجھ نے اس کی مسکراہٹ کا تعاقب کیا اور سگریٹ سلگانے لگا۔ حالانکہ وہ مجھے نہیں جانتا تھا۔ عورت نے ایک گھونٹ ہی میں گلاس ختم کر دیا۔ اور سوجھ دھیرے دھیرے پیتا رہا اور نشے کی حالت میں وہ میز پر لیٹ سا گیا۔

بیرے نے بل پیش کیا۔

"پیسے نہیں ہیں"۔ سوجھ نے کہا۔

بیرے نے سمجھا نشے میں ہے۔ اس نے بل آگے بڑھا دیا۔

"کہہ دیا پیسے نہیں ہیں"۔ یہ کہہ کر وہ پھر لیٹ گیا۔

بیرا ریستوران کے مالک کے پاس گیا اور وہ دوڑتا ہوا آیا۔

"جناب نشے میں ہیں۔ زیادہ پی لی ہے۔ بل حاضر ہے"۔ منیجر نے نہایت عاجزی سے بل سوبھ کی جانب بڑھایا۔ لیکن اس نے کوئی حرکت نہ کی۔

"میں آپ سے مخاطب ہوں جناب"۔

منیجر کے لہجہ میں درشتی تھی۔

"کیا یہاں سب بہرے ہیں۔ کوئی نہیں سنتا۔ پیسے نہیں" وہ چلّایا۔

"کیا مطلب ؟"

"منیجر غصے میں تھا۔

"مطلب۔ جتنے پیسے ملے صاحب کو دے دیئے" اور پھر اس نے اپنی دونوں جیبیں الٹ دیں۔

تو پھر آپ نے آرڈر کیوں دیا ؟"

منیجر غرّایا۔

"ایک۔۔ نشے کو دوسرے نشے سے کم کرنے کے لئے"۔

"یہاں فلاسفی نہیں چلے گی مسٹر"۔

اور منیجر نے اس کے منہ پر طمانچہ رسید کیا۔

"تو یہ چلے گا۔ میں اس کا عادی نہیں"۔

گڈ بائی۔ سوبھ اپنا گال سہلاتا ہوا اٹھنے لگا۔ منیجر نے روک لیا اور اس دوران میں وہ عورت ریستوران سے باہر جا چکی تھی۔ مجھے یہ منظر بڑا عجیب سا لگا۔ میں منیجر کے پاس گیا اس کے ہاتھ سے بل لیا۔ تین روپے کچھ آنے تھے۔ میں نے پیسے نکالے اور بیرے کے ہاتھ میں دے دیئے۔

شکریہ، منیجر نے کہا، کیا آپ انہیں جانتے ہیں ؟

"ہاں۔ میرا دوست ہے زیادہ پی لی ہے"۔

"جھوٹ۔ میں نے زیادہ نہیں پی۔ صرف ایک پیگ۔ حقیقت یہ ہے

صاحب! پیسے نہیں، معلوم نہیں لوگ سچ کو سچ کیوں نہیں مانتے۔" اُس نے میری طرف دیکھا کتنا احسان فراموش ہے۔ یہ شخص مجھے اس پر انتہائی غصہ آیا لیکن میں نے ضبط سے کام لیا۔

"تم کوئی شریف آدمی نظر آتے ہو"۔ اس نے کہا۔ "اور تم کوئی بدمعاش؟"

وہ مسکرایا۔ شکریہ گڈبائی۔ اس نے کہا اور باہر چلا گیا۔ دروازے پر وہ رکا اس نے ایک بار منیجر کی طرف دیکھا اور دہلیز پر تھوک دیا۔ اور باہر نکل گیا جب وہ باہر نکلا تو میں نے دیکھا وہ ایک پاؤں سے لنگڑاتا تھا۔ میں بڑی عجیب حالت میں تھا۔ کیا یہ وہی ہے جسے اس روز چاندنی رات میں میں نے دیکھا تھا۔ نہیں یہ وہ آدمی نہیں ہو سکتا۔ ان دو آدمیوں میں رنگ روپ خدو خال کے علاوہ اور کوئی مشابہت نہیں۔ چاندنی رات دیوار کے سائے میں کھڑا سوبھ نرم دل، ذہین، نفاست پسند پیار کرنے والا نوجوان تھا اور ریستوران کی اس چار دیواری میں نظر آنے والا سوبھ لاأبالی اور سنکی نوجوان ہے۔ جس نے نفرت سے دہلیز پر تھوک دیا ہے۔ میں نے میز سے اپنا سگریٹ کیس اٹھایا۔ اور باہر نکل آیا۔ وہ دروازے پہ ہی کھڑا تھا۔ اس نے میرے ہاتھ میں کاغذ کا ایک پرزہ دیا۔ وہ ایک لمحے کے لئے رکا۔ اور پھر آگے بڑھا۔ میں نے کاغذ کو الٹ کر دیکھا یہ میرا چارکول اسکیچ تھا۔ مجھے محسوس ہوا کہ بڑی مدت سے میں اپنے ذہن میں جو اپنی تصویر بنا رہا تھا۔ یہ اس کا خاکہ ہے۔ اسکیچ میں میری آنکھیں میرے چہرے پر نہیں میرے سینے پر ہیں۔

"یہ کیا ہے؟" میں پوچھا۔

وہ رکا۔

"میں رقم واپس نہیں کر سکتا"۔ اس نے کہا۔ اس کے لہجے میں نمایاں تبدیلی آگئی تھی۔

"تم نشے میں بالکل بدل جاتے ہو"۔ میں نے کہا

"کیا آپ مجھے جانتے ہیں؟"

اس نے تعجب ظاہر کیا۔

"ہاں۔ ایک روز چاندنی رات میں دیوار کے سائے میں تمہیں اور شیل کو۔" وہ چونکا نہیں۔ اس نے میری طرف ایک لمحے کے لئے دیکھا اور نگاہیں جھکا لیں۔

"اور آج تمہیں ایک فاحشہ کے ساتھ دیکھ کر"

وہ خاموش رہا۔

"کیا تم ایک لڑکی کے جذبات سے کھیل کر اپنی ہوس کی آگ۔" میرے لہجے میں درشتی تھی۔

"مسٹر آپ نے میرا بل ادا کیا ہے۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ آپ میری توہین کریں۔" وہ سانپ کی طرح چوٹ کھا کر بولا۔

میں اسے مزید پریشان کرنا چاہتا تھا۔

"کیا یہ جھوٹ ہے کہ رات رات بھر شراب کے نشے میں چور بازاری عورتوں کے جسموں سے لپٹے رہنے کے بعد بھی تم کہتے ہو کہ تمہیں شیل سے پیار ہے۔"

اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ اس کے چہرے پر غم کی لکیریں کھنچ گئیں۔

"تم انتہائی کمینے انسان ہو۔"

"اگر میرے پاس پستول ہوتی تو تمہیں گولی سے اڑا دیتا۔"

وہ کافی دیر خاموش رہا۔ اس نے اپنی پتلون کی جیب میں ہاتھ ڈالا جیسے پستول نکال رہا ہو۔

"میں خود ہی اپنے کو گولی سے اڑا دیتا لیکن اس کا تصور آتے ہی رک جاتا ہوں۔"

تھوڑی دیر خاموش رہنے کے بعد وہ بولا۔

"ایک بار میں نے خودکشی کا ارادہ کیا تھا۔ لیکن اس وقت میرے پاس پستول نہیں تھا۔"

"جب تک دماغ کے پرزے نہ اڑیں مجھے مرنا پسند نہیں۔" وہ خاموش ہو گیا۔
میں بالکل الجھ گیا۔

"میں اپنا دل و دماغ روح، جسم سب کچھ شیل کو سونپ چکا ہوں اور اس نے بھی مجھے اپنا سب کچھ ارپن کر دیا ہے۔ کبھی کبھی مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ میرا جسم پھٹ جائے گا۔ اگر میں۔" میں اس کا مطلب سمجھ گیا۔ وہ واقعی روحانی کرب میں مبتلا تھا۔ میں نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

"سو بھے تم ذہین آدمی ہو کر بھی ابھی تک روایتی اخلاق کے غلام ہو۔ عشق میں سب کچھ جائز ہے۔"

وہ تھوڑا مسکرایا۔ "آپ صحیح کہتے ہیں۔ لیکن اس جائزہ کی ذمہ داری لینے کی مجھ میں ہمت نہیں۔"

"تم بزدل ہو۔"

"ہاں، ورنہ ابھی تک زندہ کیسے رہتا۔"

"اور پھر بھی تم پیار کرتے ہو۔"

"ہاں۔"

میں خاموش ہو گیا۔

"ڈیئر جو کچھ تم کہتے ہو سب ٹھیک ہو گیا۔ میرا ذہن اسے قبول کرتا ہے۔"

"تو پھر؟"

"میں ایک بیکار آدمی ہوں، پیار، جذبہ حسن اس چٹان سے ٹکرا کر پاش پاش ہو جاتے ہیں۔ عشق میں آدمی جوئے شیر لا سکتا ہے۔ بے کاری میں عشق نہیں کر سکتا۔ اسی باعث ہزار نہ چاہنے پر بھی ہم اس اخلاق کے غلام ہو جاتے ہیں۔ جسے تم روایتی اخلاق کہتے ہو۔"

اگر ہم اس نئے اخلاق پر عمل کریں تو سوائے خودکشی کے کوئی راستہ نہیں۔ جسم میں سانس کی آمد و رفت قائم رکھنا ضروری ہے جو پیسے کے بغیر ممکن نہیں۔

اور جس کے بغیر پیار آہ سرد ہے۔ نفس کو آنچ نہیں"۔

"تم بڑے حقیقت پرست ہو۔ اور ذہین بھی"۔

وہ زہریلی ہنسی ہنسا" اگر دل کے بجائے پاؤں خراب ہو جائے تو آدمی حقیقت پرست ہو جاتا ہے"۔

اس کے لہجے میں طنز تھا۔

"تم مجھے کبھی مہذّب سمجھتے ہو۔ اور کبھی وحشی اگر میں نے اپنی شخصیت کو منقسم نہ کر لیا ہوتا۔ تو شیل میری وحشت کا شکار ہو جاتی یا میں اپنا جسم پھونک لیتا۔ بتاؤ کیا عشق میں جسم کی تسکین شامل نہیں۔ اور اگر آدمی بیکار ہو تو وہ وحشی نہیں ہو جائے گا یا اسے بھی وحشی نہیں ہو جانا چاہئے۔

اس کا لہجہ رقّت آمیز تھا۔ وہ وہی باتیں کہہ رہا تھا جو میں کہنا چاہتا تھا۔ فرق محض اتنا ہے کہ میں نے یہ باتیں عقل کی سطح پر کتابوں سے پڑھ کر سیکھی ہیں۔ اور اس نے اپنی روح اور جسم پر اذیتیں سہہ کر انہیں اخذ کیا ہے۔

میری ایک خواہش ہے" کافی دیر خاموش رہنے کے بعد وہ بولا۔ "شیل کی انگلیاں بڑی خوبصورت ہیں۔ کاش میں اس کے لئے سونے کی انگوٹھی خرید سکتا"۔

اس نے نظریں جھکا لیں، ہم کافی دیر تک اکٹھے چلتے رہے۔ رج روڈ پر وہ مجھ سے علیحدہ ہونے لگا۔

"اب کہاں جاؤ گے؟" میں نے کہا۔

"اسٹوڈیو میں"۔

"تم آرٹسٹ ہو۔ اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔

"تمہارا اسٹوڈیو کہاں ہے"؟

"جس عورت کو میرے ساتھ دیکھا تھا اس کے گھر میں، اور اس کا گھر۔"

وہ ہنس دیا۔ ظاہر ہے وہ عورت فاحشہ تھی، راج روڈ کے موڑ پر وہ مجھ سے الگ ہو گیا۔

ایک روز میں اس کے گھر گیا۔ اس کے کمرے میں رنگ، اور برش بکھرے پڑے تھے۔ وہ بالکل برہنہ بیٹھا کوئی تصویر بنا رہا تھا۔ میں کافی دیر اس کے پاس بیٹھا رہا۔ لیکن وہ اپنے کام میں مصروف رہا۔ اسے کچھ ہوش نہیں تھا۔

"یہ تم ننگے کیوں بیٹھے ہو"۔ میں نے سوال کیا۔

"ننگا انسان خدا کے بہت قریب ہو جاتا ہے"۔

اس نے بغیر میری طرف دیکھے جواب دیا۔

"کیا تمہیں خدا میں یقین نہیں ہے؟"

"نہیں"۔

"جب میں تصویر بناتا ہوں تو خیال آتا ہے کہ شاید خدا ہے۔ ویسے جب میں برہنہ جسم کی تصویر بناتا ہوں تو کپڑے پہن لیتا ہوں۔ وہ چھوٹی چھوٹی شرارتیں کرنے کا عادی تھا۔

"بہت دنوں سے نظر آئے"۔

میں نے پوچھا۔

"تصویر بنا رہا ہوں۔ دل اور جسم کی کشمکش میں روح کے کرب کو چہرے پر نمایاں کرنا چاہتا ہوں۔ کیسے ہوگا۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا"۔

"میں نے ابھی تک زندگی کو تصویر میں دیکھا ہے۔ اب تصویر کو زندگی میں دیکھنا چاہتا ہوں"۔

کافی دن بیت گئے ہیں میں اپنے کاموں میں مصروف رہا۔ اور سوبھ سے ملاقات نہ ہو سکی۔ ایک روز آرٹ گیلری میں ایک تاریک کونے میں اس کی بنائی ہوئی تصویر دیکھ رہا تھا کہ اچانک اس کا خیال آ گیا۔ بڑی مدت ہو گئی اس سے ملے ہوئے۔ تصویر میں روشنی اور سائے کے سنگم پر ایک زخمی عورت کا برہنہ جسم تھا۔

میں سوبھ کے گھر گیا۔ رنگ، برش، اور نا تمام تصویروں کے سوا

وہاں کچھ نہ تھا۔ دیواروں پر جسم کے مختلف اعضا کی الگ الگ تصویریں تھیں اور ان کو اپنے تصور میں یکجا کرنے سے مکمل جسم کی تصویر بنتی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس نے عالم جذب میں تصویر بنائی تھیں۔

میں نے اس فاحشہ سے پوچھا سوبھ کہاں ہے؟ کون سوبھ۔ وہ آرٹسٹ۔ اس کی بات کہتے ہو۔ وہ تو پاگل تھا سنکی۔"

میں مایوس لوٹ آیا۔ میں اس مقام پر گیا جہاں پہلی بار چاندنی رات میں میں نے اسے دیکھا تھا۔ میں اس ریسٹوران میں بھی گیا جہاں وہ شراب کے نشے میں چور تھا۔ اس سڑک پر بھی گھوما جہاں ہم نے سرگوشیاں کی تھیں۔ لیکن وہ نہ ملا۔

جب میں کسی نوجوان کی خودکشی کی خبر پڑھتا ہوں تو کانپ جاتا ہوں اور مجھے سوبھ کا فقرہ یاد آجاتا ہے۔ میں نے جب اسے کہا تھا تم بزدل ہو۔ تو اس نے جواب دیا تھا۔ ہاں۔ ورنہ میں ابھی تک زندہ کیسے رہتا۔ شاید۔ اور اس کے آگے میں کچھ نہ سوچ سکا۔

ہر رات کو ساڑھے گیارہ بجے میں اس مقام سے گزرتا ہوں۔ سامنے مکان کا در کھلتا ہے۔ دو آنکھیں باہر جھانکتی ہیں۔ میں ایک لمحے کے لئے رکتا ہوں اور پھر تیزی سے آگے بڑھ جاتا ہوں۔

مجھے خدا میں یقین نہیں۔

لیکن میں نے بجلی کے کھمبے تلے، دیوار کے سائے تلے، دیوار یا درخت کی چھایا میں ایسا نور دیکھا ہے جو خدا کے سوا اور کوئی نمو نہیں کر سکتا۔"

رُوح کا ایک لمحہ اور سُولی پر پانچ برس

اوورکوٹ کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے اور کالر اٹھائے میں پلیٹ فارم پر کھڑا تھا۔ میری جیب میں خط پڑا تھا۔ جسے بار بار میں انگلیوں سے چھو رہا تھا۔ اور محسوس کر رہا تھا کہ انگلیاں ایک ایک لفظ کو پڑھ رہی ہیں۔

۲۲ر کو فرنٹیئر میل سے آرہی ہوں ۔۔۔ نشی۔

آج دسمبر کی ۲۲ر تاریخ ہے سگنل گر چکا ہے۔ کچھ ہی منٹوں میں فرنٹیئر میل آرہی ہے لیکن نشی ۔۔! نشی کون ہے؟ میری انگلیاں پھر ایک بار خط پر حرکت کرنے لگیں۔

۲۲ر کو فرنٹیئر میل سے آرہی ہوں ۔۔۔ نشی۔

نشی کے نام پر پھر میں رک گیا۔ اگر گاڑی کی وسِل سے چونک نہ پڑتا تو شاید اِسی ایک نام پر نہ جانے کب تک رکا رہتا۔ عورتوں کا ڈبّہ تیزی سے میرے سامنے سے گزر گیا۔ میں نے مضبوطی سے خط پکڑ لیا۔ ڈبّے سے چہرے باہر جھانک رہے تھے۔ ہاتھ ہل رہے تھے۔ لوگ پہچانے ہوئے چہرے دیکھ کر مسکرا رہے تھے۔ جواب میں ہاتھ ہلا رہے تھے۔ دوڑ رہے تھے۔ وہ کون سا چہرہ ہے جو مجھے دیکھ رہا ہے، وہ کون سا ہاتھ ہے جو مجھے بلا رہا ہے۔ نشی تم کون ہو؟ تم مجھے کیسے جانتی ہو؟ میرے پاس کیوں آرہی ہو؟ شاید یہ خط میرے لئے نہ ہو۔ میں ایک دم گھبرا گیا۔ میں نے جیب سے خط نکالا پتہ پڑھا۔ نام میرا تھا، پتہ میرا تھا۔ لیکن نشی؟

"امیش" جیسے جیب سے آواز آئی۔ میں نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ نشی کھڑی تھی (ظاہر ہے وہ نشی ہی ہوگی)، وہ مسکرا رہی تھی۔ اس کے بال اڑے اڑے تھے اور چہرے

پر سفر کی تھکن کے آثار تھے۔ لیکن وہ مسکرا رہی تھی۔ وہ چند ثانیے اسی طرح کھڑی رہ کر مسکراتی رہی۔

"پہچانا مجھے:" اس نے پوچھا۔

"ہاں۔ نشی۔"

وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔" اس لئے کہ تمہیں نشی کا خط ملا۔ اگر اس کے نیچے اوشا، اُما یا شانتا ہوتا تو ہیں۔"

"بڑی تیز لڑکی ہو۔"

"لڑکی نہیں ڈیئر۔ عورت"۔ اس نے پاس کھڑی بچی کی طرف اشارہ کیا۔

"بڑی ذہین ہے۔ میں نے سوچا۔ اس نے میرے چہرے کی طرف دیکھا اور مسکرا دی۔

"اب میں بڑی ہو گئی ہوں نا:" اس نے میرا ہاتھ پکڑا اور پلیٹ فارم سے باہر کی طرف چل دی۔ اب کے کھیل میں جیت دشوار تھی۔ فن کا مقابلہ معصومیت سے تھا بمعصومیت جو شعور کی حدوں کو چھو لینے سے پیدا ہوتی ہے۔

"دیکھو اشیش" جب ہم ٹیکسی میں بیٹھ چکے تو اس نے کہا " انسان کی زندگی میں پانچ برس بڑا لمبا عرصہ ہوتا ہے، وقت کی رفتار میں چہرے اور دل بدل جاتے ہیں۔ لیکن کوئی ایک ایسا لمحہ ہوتا ہے جو منجمد ہو کے کہیں چھپ جاتا ہے اور پھر کسی انجانی حرارت سے پگھلنا شروع ہو جاتا ہے اور ان پانچ برسوں پر محیط ہو جاتا ہے۔ انسان کی رگوں میں لاوے کی طرح بہنے لگتا ہے۔ دل کی تہوں میں گرم لوہے کی طرح حرکت کرتا ہے۔ اس کی تاب لانا مشکل ہے۔ اگر تمہارے دل اور جسم میں اتنی سکت ہے کہ اس آگ سے لپٹ جاؤ تو تم جنیس ہو ورنہ —" وہ پہلی بار سنجیدہ ہو گئی۔

نشی اب میرے لئے اجنبی لڑکی نہیں تھی۔ اس کے ہاتھوں کی گرمی اور ہونٹوں کی مسکراہٹ میری جانی پہچانی تھی۔ بس پانچ برسوں میں میں اسے

بھول سا گیا تھا۔ اس نے ٹھیک کہا تھا کہ پانچ برس بہت لمبا عرصہ ہوتا ہے۔
اس میں چہرے اور دل بدل جاتے ہیں۔

"تو تمہاری شادی ہو گئی۔" میں نے بات چھیڑنے کی غرض سے کہا۔

"اور لڑکی بھی۔" اس نے جواب دیا۔

"میں نے اُس کی لڑکی کی طرف دیکھا۔ سپید چہرہ۔ چھوٹی چھوٹی آنکھیں
ماتھے پر کٹے ہوئے بال، چینی گڑیا۔

چین میں پیدا ہوئی ہے"۔ میں نے اس کے بالوں چھوتے ہوئے کہا۔
لڑکی کی چھوٹی چھوٹی آنکھیں اور پتلے پتلے ہونٹ کھل اٹھے۔ دونوں
مسکرا دیں۔

"میں نے اس کا نام بھی چینی گڑیا رکھا ہے۔ اس کے ہاتھوں میں شترون
کا زیر و بم ہے اور پاؤں میں بجلی کی تھرکن اس کا ناچ دکھاؤں گی تمہیں۔"

ظاہر تھا کہ نشی اپنی شادی کی بات کرنا پسند نہیں کرتی تھی۔ شاید وہ ان
چند لمحوں میں اپنی اس زندگی کو بھول جانا چاہتی تھی۔ شاید وہ اس زندگی
سے کچھ لمحوں کے لئے فرار کر کے میرے پاس آئی تھی۔ لیکن میں تو اب ساری زندگی
سے فرار کر چکا تھا۔ انجام بڑا خطرناک تھا، لیکن دلچسپ بھی۔

گھر آگیا تھا۔ ہم نے سامان اتارا اور کمرے میں داخل ہو گئے۔

"تم تھکی ہوئی ہو۔ آرام کر لو۔ میں چائے بناتا ہوں۔"

"ابھی نہیں۔ چائے تو سکون سے پینی چاہئے۔ تم ہی تو کہتے تھے کہ چائے
اور پیار کے لئے جذبہ چاہئے۔"

نشی ادھر ادھر کمرے میں گھومنے لگی۔ اُس کی بچّی کو نہ معلوم کیوں میں
ایلیس کے نام سے پکارنے لگا۔ وہ آرام کرسی پر بیٹھے بیٹھے سو گئی۔ نشی کمرے میں
پڑی تصویروں کو دیکھنے لگی۔ وہ ایک تصویر پر تھوڑی دیر رک گئی۔

"پسند آئی۔" میں نے پوچھا۔

"ہاں۔ لیکن ہاتھ پاؤں میں زنجیروں کی کیا ضرورت تھی؟"

تصویر کیوبک آرٹ کا نمونہ تھی جس میں مختلف اداس رنگوں کے پس منظر میں ایک آدمی کی تصویر کشی کی گئی تھی۔ مختلف رنگ اُن پابندیوں کے مظہر تھے۔ جن میں انسان جکڑا ہوا ہے۔

"زنجیروں کے بغیر یہ تصویر روح کی غلامی کی اذیت کا مظہر بن جاتی۔ زنجیریں غیر ضروری ہیں۔"

"تمہیں آرٹ میں کب سے دلچسپی ہو گئی۔"

"اس کے لئے کوئی ایک لمحہ متعین نہیں کیا جا سکتا۔"

"ویسے میرا خیال تھا کہ زندگی کے کسی بھی لمحے تم آرٹسٹ بن سکتی ہو۔"

"وہ کیسے؟ حالانکہ جب تم آرٹ اور ادب کی باتیں کرتے تھے تو میں بور ہو جاتی تھی۔"

"یہ میرے دل کی آواز تھی۔"

وہ میری طرف دیکھنے لگی۔

"بات یہ ہے لنشی۔ تم اپنی روح کو اپنے جسم سے ظاہر کرتی ہو۔ میں نے کہا تھا۔ تم نے جواب دیا تھا۔ تم ٹھیک کہتے ہو۔ میرا جسم ہی میرا ذہن ہے۔ میں کئی لمحے تک سوچتا رہا کہ زندگی کو پرکھنے کا شعور تم میں ہے۔"

"ہاں ہاں جینیس جو ٹھہری۔" وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

"باتھ روم کدھر ہے؟" اس نے کپڑے سنبھالے اور باتھ روم چلی گئی۔

ایلس سو رہی تھی۔ اور میں سوچ رہا تھا۔ لنشی کتنی بدل گئی ہے۔

اس کے جسم سے جیسے برقی رو اٹھتی رہتی تھی۔ کٹے بال، بغیر بازو کی قمیض، پھول کی طرح کھلتی ہوئی مسکراہٹ۔ جب میں اس کے بہت قریب آگیا تھا جہاں روح اور جسم کی حدیں ملتی ہیں۔ تو وہ بولی۔

"اتنی دیر تک کیا سوچتے رہے؟"

"کچھ نہیں۔"

"بدھو ہو۔" اُس نے کہا۔

جب بھی میں اُس سے کوئی سوال کرتا تو اس کا جواب ہوتا "پتہ نہیں"۔ میں خاموش ہو جاتا۔ میں نے دھیرے دھیرے محسوس کیا کہ نشی کا جسم ہی اس کی زبان ہے۔ اس کی روح کو پانے کا راستہ اُس کا جسم ہے۔

نشی نہا کر واپس آ گئی تھی۔ میں نے اسٹوو جلایا اور چائے کا پانی رکھ دیا۔ وہ آئینے کے سامنے کھڑی بال سنوارنے لگی۔

"ایلس کو جگاؤں"۔ میں نے کہا۔

اس نے ایلس کی طرف دیکھا۔ "رہنے دو۔ شاید کوئی خواب دیکھ رہی ہے"۔

میں نے ایلس کے چہرے کی طرف دیکھا۔ اُس کے ہونٹ ہل رہے تھے۔

میں اس کی پیشانی چومنے کے لئے اس پر جھکا۔

"سوئے ہوئے بچے کو پیار نہیں کرتے"۔ نشی نے کہا۔

"کیوں؟"

"پتہ نہیں"۔ پرانی نشی پیدا ہو رہی تھی۔

"نشی تم تو جاگ رہی ہو نا"۔ میں نے اس کی خوابیدہ نگاہوں کی طرف دیکھا۔ وہ سفید ساری میں ملبوس تھی۔ وہ چائے بنانے میں مشغول تھی۔ آرام کرسی پر ایلس سو رہی تھی۔ میں اخبار دیکھ رہا تھا۔ مجھے آج اپنا کمرہ گھر نظر آ رہا تھا۔ جس میں پیار کرنے والی بیوی ہے۔ اور پیار پانے والا بچہ۔ اس کمرے میں نشی پہلی لڑکی (عورت) نہیں جو چائے بنا رہی ہو۔ اور جس کے بال شانوں پر لہرا رہے ہوں۔ لیکن گھر کا احساس آج پہلی بار ہو رہا تھا۔ شاید اس لئے کہ پانچ برس بڑا لمبا عرصہ ہوتا ہے۔ اور آدمی کا چہرہ اور دل بدل جاتے ہیں۔

"آشی، دیکھو چائے تیار ہے۔"

ایلس پھر کروٹ بدل کر سو گئی۔

"تھک گئی ہے آشی۔"

نشی نے ایلس کے گالوں کو سہلایا۔ اسے اٹھا لیا اور باتھ روم میں چلی گئی۔

تھوڑی دیر میں چائے اور ایلس دونوں ہی تیار ہوگئیں اور ہم چائے پینے لگے۔

"امیش تمہیں تعجب تو ہوا ہوگا، میرا خط پا کر۔"

"ہاں بات یہ تھی کہ خط بڑا مختصر تھا اور پھر پانچ برس بیت گئے تھے۔"

"ہاں۔ میں بھی ذرا بزرگ ہو گیا ہوں، باتیں بہت کم یاد رہتی ہیں۔"

"باتیں عمر کے ساتھ نہیں، جذبے کی کمی کے باعث بھولتی ہیں۔"

"شاید۔"

"آدمی زندگی کو تین طرح سے محسوس کرتا ہے۔ جسم سے، دماغ سے اور دل سے۔"

میں نشی کے چہرے کی طرف غور سے دیکھ رہا تھا۔

"پانچ برس پہلے میں نے زندگی کو جسم سے محسوس کیا تھا اور تم نے دماغ سے اور جذبہ دل سے محسوس کئے بغیر پیدا نہیں ہو سکتا۔"

تھوڑی دیر خاموش رہنے کے بعد وہ بولی۔

"اور یہ احساس کہ تم جذبے سے محروم ہو گئے ہو۔ بڑا اذیت ناک ہوتا ہے تم سوچتے ہو گے میں تمہارے پاس کیسے آگئی۔ اسی احساس کے باعث شاید اس ایک لمحے کو پھر سے تازہ کر کے زندگی کو دل سے محسوس کر سکوں اور اس ایک لمحے کو ساری زندگی پر محیط کر سکوں۔"

ہم چائے پیتے رہے اور دیر تک باتیں کرتے رہے۔ میں نے فن کے راز کو پا لیا تھا لیکن میں نے ہر چیز کو اس کی بلند سطح پر ہی لیا ہے۔ نشی کہا کرتی تھی کہ شادی زہر ہے۔ لیکن اسے شادی کرنی پڑی۔ معلوم نہیں پانچ برس تک وہ اس زہر کو کیسے پیتی رہی۔ جب یہ زہر اس کی رگوں میں سرایت کرنے لگا تو اس نے ادب و فن میں دلچسپی لینی شروع کر دی جس سادگی سے وہ پیار کرتی تھی۔ اسی سادگی

سے وہ اب کتابوں، ادیبوں اور مصوّروں کے بارے میں بات کرتی ہے۔ جب میں نے اس سے پوچھا کہ دتّی اچانک کیسے آ گئی، اُس نے جواب دیا کہ ایک روز میں سٹول کی ایک نظم پڑھ رہی تھی۔ مجھے محسوس ہوا کہ منجمد لمحہ جو میرے دل کے کسی گوشے میں چھپ کر بیٹھا تھا پگھلنے لگا ہے اور لاوے کی طرح میری رگوں میں بہنے لگا ہے۔ اچانک تمہاری یاد آئی اور اس نے سِٹول کی وہ نظم سنائی۔

STILL FALLS THE RAIN,

DARK AS THE WORLD OF MAN, BLACK

AS OUR LOSS, BLIND AS THE NINTEEN

HUNDRED AND FORTY NAILS UP ON

THE CROSS

دن بھر میں ایلس سے کھیلتا رہا۔ نشی کوئی کتاب پڑھ رہی تھی۔ اور کچھ دیر تک باتیں کرتے رہے۔ جب شام کے سائے پھیلنے لگے تو ہم باہر نکلے۔ نشی نے اُسی طرح بغیر بازو کی سرخ قمیص پہنی۔ اس نے ریشمی بالوں کو ہوا میں اڑنے دیا۔

"نشی تم بالکل ویسی ہی نظر آتی ہو جیسی پانچ برس پہلے تھیں"

روشنی دھیرے دھیرے کم ہو رہی تھی۔ اندھیرا دھیرے دھیرے بڑھ رہا تھا۔ سورج ڈوب چکا تھا۔ دور اُس پار شفق پر پھیلتی ہوئی روشنی بادلوں میں اُودے، سیاہ اور سرخ رنگ بھر رہی تھی۔ ہم دونوں خاموش بیٹھے رہے۔ نشی نے میرے کندھے پر سر رکھ دیا۔ میں نے اُس کا ہاتھ تھام لیا۔ نشی نے میرا ہاتھ پکڑ لیا۔ میں نے اس کی طرف دیکھا اور اس نے نگاہ جھکا لی اور دور شفق کی ساری سرخی ایک دم سمٹ کر اُس کے چہرے پر چھا گئی۔ اُس ایک لمحے میں نشی نشی نہیں تھی کوئی ماورائی حقیقت تھی۔ اُس کے ہونٹ کپکپانے لگے۔ اس نے زور سے میرا ہاتھ دبا دیا۔ میں نے اس کے ہونٹوں پر اپنے ہونٹ رکھ دیئے۔ مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے ساری کائنات سمٹ کر ان ہونٹوں میں سما گئی ہے، اور یہ

ہونٹ پھیل کر ساری کائنات پر چھا گئے ہیں۔ نشی کی آنچ میرے چہرے پر خوش کن لمس دے رہی تھی۔ چاروں طرف سناٹا تھا۔ جیسے وقت کی رفتار رک گئی ہو۔ نامعلوم کب تک اس کے ہونٹ میرے ہونٹوں پر رہے۔ مجھے ایسا محسوس ہوتا رہا کہ میری روح پر گلاب کی دو نازک پتیاں لرز رہی ہیں۔ اور جب میں نے آنکھیں کھولیں تو رات ہو چکی تھی، چاروں طرف اندھیرا تھا۔ میں اور وہ اندھیرے میں ڈوب گئے تھے۔ اس کا ہاتھ میرے ہاتھ میں تھا۔ دور جیسے پروں کے پھڑپھڑانے کی آواز آرہی تھی۔ "کسی پرندے کی"۔

گلین

"کل ہم گلین جا رہے ہیں"۔ روبن نے کہا۔

"کل؟"

"ہاں کل"۔

"کل نہیں جا سکتے۔ کل مِس شملہ کا انتخاب ہے"۔ میں نے کہا۔

"اوہ۔ تو پھر میں ہی چلا جاؤں گا"۔

"تمہیں مِس شملہ کے انتخاب میں کوئی دلچسپی نہیں۔ کیا بور آدمی ہو"۔ میں نے کہا۔

"دلچسپی تو بڑی ہے لیکن اِس موسم میں شملہ کا منظر دیکھنا چاہتا ہوں۔ مِس شملہ تو ہر شہر میں مل جاتی ہے"۔ روبن نے کہا اور کتاب پڑھنا شروع کر دیا۔

"بات دراصل یہ ہے روبن۔ تم اب مر چکے ہو۔ ورنہ اس اندھیرے کمرے میں بند صبح سے شام اور پھر رات گئے تک کتابیں پڑھتے رہنے میں کونسی لذّت ہے۔۔۔۔ اور پھر کتابیں بھی تو شملہ نہیں"۔ میں نے کہا۔

"صحیح کہتے ہو، لیکن ہر کتاب پڑھنے کے لئے ایک مخصوص ماحول ہوتا ہے۔ کچھ کتابیں سردیوں کی رات میں آتش دان کے قریب پڑھی جاتی ہیں، کچھ درخت کے سائے میں، کچھ بجلی کے کھمبے کے نیچے، کچھ بس اسٹاپ پر انتظار کرتے ہوئے، کچھ ریل کے سفر میں، کچھ بارش میں بھیگتے ہوئے اور کچھ۔۔"

"اور کچھ؟"

وہ محبوب کے پہلو میں" وہ مسکرایا اور پھر کتاب پڑھنے میں مشغول ہو گیا۔

"لیکن لیڈی چیٹر لیز لور، تو تم نے دلّی میں ہی پڑھ لی تھی۔ اب دوبارہ پڑھنے کی کیا ضرورت پڑ گئی؟" میں نے پوچھا۔

"ایک کتاب کو دوسرے مقام پر پڑھنے سے اکثر اس کے معنی بدل جاتے ہیں۔" اس نے کہا۔ "اب اسی کتاب کو لو، جب میں نے اسے دلّی میں پڑھا تھا تو میرا نعرہ تھا، جسم کی پکار سنو، جسم ہی صداقت ہے۔ زندگی کو جسم کے لمس سے محسوس کرو، لیکن آج شملہ کی اس برفانی فضا میں، تنہائی کے لمحوں میں، دلّی سے دور اسے پڑھتے ہوئے کچھ یوں محسوس ہوتا ہے کہ جسم سے پرے بھی کچھ آوازیں ہیں۔ کچھ رنگ ہیں، کچھ دائرے ہیں....." وہ ایک دم خاموش ہو گیا۔

"یہ شاعری ہے یا فلسفہ، ماورائی تخیّل" میں نے کہا۔ "اطلاعاً عرض ہے کہ مس شملہ کا انتخاب شملے کا ایک خاص حادثہ ہوتا ہے۔ اور کل تم گلین جا رہے ہو گلین" میں نے سگریٹ سلگاتے ہوئے کہا۔ لیکن روبن نے کوئی جواب نہ دیا۔ اور متواتر کتاب پڑھتا رہا۔ میں نے کپڑے بدلے اور باہر چلا گیا۔

میرے جسم میں ایک عجیب بے چینی سی، ایک اُمید، ایک موہوم خوف کا مدوجزر تھا۔ آج ڈالی نے مجھے ڈانس کے لئے مدعو کیا تھا۔ اس کے لمس کے تصوّر سے ہی میری رگوں میں شراب اُبلنے لگی۔ چھریرے بدن، سانولے رنگ، لہرائے بالوں والی لڑکی کا نام ڈالی تھا۔ شملے میں اس بار ڈالی کا بڑا چرچا تھا۔ بال روم میں، بار میں، کافی ہاؤس میں، سکیٹنگ رنگ میں، تھیٹر میں، جیسے ڈالی ایک نہیں اس کے کئی روپ ہیں۔ لوگ اسکینڈل پوائنٹ پر اس طرح کھڑے ہو جاتے ڈالی کے انتظار میں جیسے وہ تازہ ہوا کا جھونکا ہے، ہر سانس کے لئے، زندہ رہنے کے لئے۔ دور سے شعلے کی طرح لپکتی ہوئی کوئی لڑکی نظر آئی، آنکھیں سمجھیں ڈالی آ گئی۔ سنا ہے کناٹ پلیس کی سڑکوں سے پھسل کر ڈالی کے حسن کے سائے شملے کی پہاڑیوں پر پھسلنے لگے ہیں۔ اور اس سائے سے لپٹنے کے لئے اس میں دم لینے کے لئے سڑکوں پر لوگ کئی سائے بڑھتے ہیں گھٹتے۔

جب میں "ڈیوی کو" پہنچا تو ڈالی کیپٹن ملک کے ساتھ بیٹھی کافی پی رہی تھی۔ مجھے دیکھتے ہی اس نے اشارہ کیا اور میں نے محسوس کیا کہ ڈالی جیسے کیپٹن کے جسم کو چیر کر نکل آئی ہے۔ اور پیالی کے رم پر کھڑی مجھے پکار رہی ہے۔ میں اس کے سامنے کرسی پر بیٹھ گیا۔ اس نے کیپٹن ملک سے میرا تعارف کرایا۔ گورا چٹا، لمبا، خوبرو سڈول جوان تھا۔ کیپٹن ملک اور ڈالی اس کی شخصیت مقناطیسی ہے۔ کیپٹن ملک پیرس کی نائٹ کلبوں کی رنگینیاں، بیان کر رہے تھے۔

"سگریٹ کے دھوئیں کے غبار میں چھلکتے ہوئے جام اور مدہوش عورتیں، تھرکتے ہوئے جسم، اور آدمی کو احساس ہوتا ہے خدا کوئی نہیں، روح تخیل ہے، جسم ہی حقیقت ہے، جسم ہی خدا ہے۔ آگ اگلتے ہوئے جسموں کے باہم لپٹنے سے بڑی کوئی حقیقت نہیں، کوئی لذت نہیں" کیپٹن ملک کہہ رہے تھے۔ ان کے چہرے پر میلی میلی آگ کی چمک تھی۔ ڈالی خاموش تھی میلی مٹیالی آگ اس کے چہرے پر پھیل رہی تھی۔ شاید میز پر غبار ہوئے سگریٹ کے دھوئیں کے باعث مجھے ان کے چہرے کچھ ایسے نظر آئے۔ اس غبار کے پیچھے دروازے پر مسز پرمیندا کی تصویر ابھری۔ کیپٹن ملک اُسے دیکھتے ہی مسکرائے اور اٹھ کھڑے ہوئے۔ ڈالی بھی اٹھ کھڑی ہوئی۔ ڈالی کیپٹن ملک کے اتنے قریب تھی کہ مجھے محسوس ہوا کہ کیپٹن ملک کا جسم مقناطیس ہے لیکن مقناطیس جا چکا تھا۔ اور ڈالی صوفے پر گم سم بیٹھی سگریٹ سلگا رہی تھی۔ کافی کا آخری گھونٹ انڈیلنے کے بعد میں نے ڈالی کو ڈانس کے لئے مدعو کیا جیسے وہ ایک دم چونک پڑی۔ اس نے آدھ جلا سگریٹ کافی کی پیالی میں پھینک دیا۔ ایک عجیب سی آواز آئی سگریٹ کے بجھنے کی۔

میں اور ڈالی ناچ رہے تھے۔ اس کی کمر کے گرد میرے بازوؤں کا گھیرا تنگ ہوتا جا رہا تھا۔ اور دوسرے ہاتھ میں اس کا نرم سفید ہاتھ تھا۔ اس کی انگلیوں کے کناروں سے جیسے بجلی کی شعاعیں پھوٹ رہی تھیں۔ جسموں کی گردش میں احساس کے دائرے پھیلتے سمٹتے جا رہے تھے۔ اُس کے جسم کی آنچ، خوشبو، رنگ اور لمس کی آواز میرے جسم میں تحلیل ہو رہے تھے۔ دھیرے دھیرے ہم ایک دوسرے کے قریب ہوتے جا رہے تھے۔

اس کا چہرہ میری گردن کے دائرے میں سلگ رہا تھا۔ اور میرے سینے پہ نرم نرم سی آنچ لپٹ رہی تھی۔ کبھی قریب اور کبھی دور اور ایک شدید جذبہ تھا ایک دوسرے میں مدغم ہو جانے کا۔ روشنی مدھم مدھم تھی، گردش میں ہم تھے۔

"زمین کا محور کہاں ہے ڈالی" میں نے پوچھا۔ اور اس نے میری گردن پر جلتے ہوئے ہونٹ رکھ دیے۔ اور مجھے گیان ہوا کہ برف کو آگ کیسے لگتی ہے۔ اچانک مجھے ایک شعر یاد آیا اور میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔

"کیا بات ہے ڈارلنگ"۔ ڈالی نے آنکھ کے اشارے سے پوچھا۔

"ایک شعر یاد آیا ہے"۔

"کیا؟"

"اے مری ہم رقص مجھ کو تھام لے
زندگی سے بھاگ کر آیا ہوں میں

"بیوٹی فل"۔ اس نے کہا۔

"لیکن یہ شعر اگر یوں ہوتا تو زیادہ موزوں تھا۔

اے مری ہم رقص مجھ کو تھام لے
روبن سے بھاگ کر آیا ہوں میں

وہ سکتہ پڑتا ہے، لیکن بات صحیح ہے"۔ میں نے کہا۔

"روبن کون ہے؟" اس نے پوچھا۔

"ایک دوست ہے شملہ ہی میں ملاقات ہوئی ہے۔ بڑا دلچسپ آدمی ہے اور بڑا بور بھی"۔ میں نے کہا۔

ڈالی کا چہرہ روشنی سے ہٹ چکا تھا۔ گردش اتنی مدھم تھی کہ معلوم ہوتا تھا کہ روشنی کے سامنے چہرہ آتے آتے جگ بیت جائے گا۔ خوشبو تھی سہمی سہمی، آنچ تھی مٹتی مٹتی اور پھر جیسے جسم نہیں تھا، برف کی سل تھی میرے بازوؤں میں۔

"کیا بات ہے ڈالی؟" میں نے پوچھا۔

"مجھے کچھ قطرے شراب چاہیئے۔ شاید باہر برف پڑ رہی ہے"۔ اس نے کہا اور اس کے پاؤں رک گئے۔

ہم کاؤنٹر کی طرف بڑھے، شراب کے دو گلاس ہمارے سامنے آگئے۔ کاؤنٹر پر روبن بھی کھڑا تھا۔ شراب کا گلاس اس کے سامنے پڑا تھا، اور وہ کوئی کتاب پڑھ رہا تھا۔

"ہیلو روبن یہاں بھی کتاب۔" میں نے پوچھا "کیا پڑھ رہے ہو"۔

"بھگوت گیتا"۔

"گیتا"۔ جیسے میرا سانس ایکدم رک گیا ہو۔ میں نے ایک نظر شراب پر ڈالی اور ایک روبن پر۔ "آر یو سوبر" میں نے پوچھا۔

"یس"۔ اس نے کہا۔

"تو تم مکمل پروفیسن ہو"۔ میں نے کہا۔

"اس میں تعجب کی کیا بات؟ بھگوت گیتا پڑھنے کے لئے اس سے زیادہ موزوں مقام مجھے کوئی نہیں ملا۔ شراب، حسین جسموں کی گردش، عارضوں کی روشنی، نفس کی آنچ، مسکراہٹیں، سرگوشیاں، زندگی کی ہر لذت تمہیں پکار رہی ہے۔ اور تم شانت کھڑے ہو سمجھت، پرتگیا جنگل کی تنہائی میں دنیا و مافیہا سے دور تو ہر کوئی یوگی بن سکتا ہے"۔ اس نے شراب کا گلاس اٹھایا اور ایکدم خالی کر دیا۔

اس نے گیتا کو ہپ پاکٹ میں رکھ لیا۔ ہم صوفے پر آکر بیٹھ گئے۔ روبن نے سگریٹ سلگایا "یہ نیا کوروکیشتر ہے۔ ہم ہی ارجن ہیں اور ہم ہی کرشن"۔ اس نے کہا۔

میں نے ڈالی اور روبن کا تعارف کرایا۔

"سگرٹ" روبن نے ڈالی سے پوچھا۔

"نو تھینکس"۔ اس نے کہا۔

"یہ ترشے ہوئے لب اور لمبی سفید انگلیاں اور آپ سگرٹ نہیں پیتیں"۔ روبن نے ڈالی سے کہا۔ وہ خاموش رہی اور گلاس پر جھکی رہی۔

"ہونٹوں اور انگلیوں کے حسن سے سگریٹ کا کیا رشتہ" میں نے روبن سے پوچھا۔

"ڈالی جیسی عورت کے قرب میں تو آدمی شاعر ہو جاتا ہے۔ اور تم نرے جرنلسٹ ہی رہے" اس نے کہا۔

"روبن تم نے سنا ہے راشد کا شعر

"اے مری ہم رقص مجھ کو تھام لے
زندگی سے بھاگ کر آیا ہوں میں"

میں نے کہا۔

"زندگی سے بھاگ کر آیا ہوں میں۔ ایکسی لینٹ" وہ اچھل پڑا۔

"لیکن میں نے اس میں ترمیم کی ہے" میں نے کہا۔

"کیا؟"

"یعنی تم سے بھاگ کر آیا ہوں میں" وہ بڑے زور سے ہنسا۔

"روبن بھی کسی سے بھاگ کر آیا ہے؟" اس نے کہا" اور شاید آپ بھی مسز ڈالی"

"زندگی میں سب ہی فرار کرتے ہیں۔" ڈالی نے جواب دیا۔

"ہاں یہی تو مصیبت ہے اور وہ پھر مل جاتے ہیں" روبن نے سگریٹ کی راکھ جھٹکتے ہوئے کہا۔

"فرار تب ہی ممکن ہے اگر ایک اپنی جگہ پر قائم رہے" اس نے کہا۔

ڈالی نے کوئی جواب نہ دیا اور گلاس ہونٹوں سے لگا لیا۔

"دیکھئے نا، میرا دوست بھی مجھ سے بھاگ کر آیا تھا اور میں پھر اسے مل گیا"

روبن باتیں کر رہا تھا میں اور ڈالی سن رہے تھے۔ ڈالی نے مجھ سے سگریٹ مانگا۔ میں نے دیا سلائی جلائی۔ دیا سلائی کی روشنی میں ڈالی کا چہرہ چمکا۔ اس نے ایک لمبا کش لیا۔ بڑی دیر تک دھواں میز پر پھیلا رہا۔

دھوئیں کے غبار میں ڈالی کا چہرہ کتنا پر معنی، کتنا دلکش نظر آ رہا ہے...

جیسے کتاب کھل جائے اور الفاظ ڈالی کے خدوخال میں ڈھل جائیں۔" روبن نے انجانے میں ڈالی کے منہ پر دھواں چھوڑتے ہوئے کہا۔ شاید ڈالی نے اسے بُرا محسوس کیا۔ وہ ایکدم بول اٹھی۔

"مسٹر روبن، زندگی کتاب نہیں۔ نہ بند نہ کھلی۔ بلکہ زندگی ہے۔ اس میں جسم کی گرمی اور خون کی گردش ہے۔"

"اور شاید دل کی دھڑکن بھی"۔ روبن بولا۔

"لیکن وہ کتاب ہرگز نہیں"۔ ڈولی اب جوش میں بول رہی تھی۔

"شاید"۔ روبن نے کہا اور فوراً ہِپ پاکٹ سے گیتا نکال کر ایک شلوک پڑھنا شروع کر دیا۔

ڈولی اب آفلیسو پر تھی۔

"زندگی کتاب نہیں، شراب ہے، چھلکتی ہوئی"۔ ڈالی نے گلاس لہرایا اور شراب روبن کے چہرے پر بکھر گئی۔

"ہاں لیکن جب شراب چھلکتی ہے تو کم بخت روبن کے چہرے پر بکھر جاتی ہے۔" روبن نے کہا۔ ڈالی کے ہاتھ سے گلاس چھوٹ گیا اور میز پر سے پھسلتا فرش پر جا گرا۔ روبن نے گلاس اٹھایا اور میز پر رکھ دیا۔ اُس نے گلاس کی طرف دیکھا اور پھر ڈالی کے چہرے کی طرف۔ ڈالی کا چہرہ خالی گلاس کی طرح تھا۔

"ایک پیگ اور!" روبن نے پوچھا۔ ڈالی نے انکار کر دیا۔ وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ اس نے اپنی ساڑھی سے شراب کی بوندیں صاف کیں اور سیڑھیاں اترنے لگی۔ میں بھی اس کے ساتھ ہو لیا۔ روبن نے سگریٹ سلگا لیا اور نیچے اتر آیا۔ ہم تینوں خاموش سیڑھیاں اتر رہے تھے جیسے اندھیرے میں کسی سُرنگ میں داخل ہو گئے ہوں۔ نیچے آ کر ہم رک گئے۔ بجلی کے کھمبے کے نیچے ہم کھڑے تھے۔ روبن نے کوٹ کے کالر اٹھائے۔ ڈالی نے روبن سے ہاتھ ملاتے ہوئے کہا۔

"روبن صاحب کل سیشل آیئے گا، مس شملہ کا انتخاب ہے"۔

"مس شملہ کا انتخاب تو ہو گیا۔" روبن نے کہا۔

"کون؟" ڈالی نے حیرت سے پوچھا۔

"مسز ڈالی واڈیا" اس نے سگرٹ کو بجلی کے بلب کی طرف پھینکتے ہوئے کہا۔

"کل میں گلیمن جا رہا ہوں" روبن نے کہا اور چلا گیا۔

میں محو حیرت تھا کہ یہ تماشا کیا ہوا۔ میں اور ڈالی دھیرے دھیرے ہوٹل کی طرف چل پڑے۔ راستے بھر ہم خاموش رہے۔ ڈالی جب شراب پی لیتی ہے تو بالکل خاموش ہو جاتی ہے۔ جب میں نے اسے اس کے ہوٹل چھوڑا تو وہ ایک سہمی ہوئی سی ٹھٹھری ہوئی لڑکی تھی۔ دروازے پر وہ رکی۔ اس نے اپنے بازو میری گردن میں حمائل کر دئے۔

"کل صبح آؤں گا" میں نے کہا۔

"پلیز ڈو۔!" اس نے کہا اور دونوں ہاتھوں میں میرا چہرہ تھام لیا اور میرے ہونٹ چھو لئے۔

"کل میری زندگی کا حسین ترین دن ہے۔۔۔ مس شملہ" اس نے کہا اور اندر چلی گئی۔

میں واپس چلا آیا۔ راستے بھر میرے تصور میں ڈالی کی تصویریں ابھرتی رہیں۔ کتنی جاذب ہے ڈالی۔ نو خیز، جوان اور کبھی کبھی تو ہیبن کبھی۔ لیکن کبھی کبھی وہ اچانک اداس ہو جاتی ہے۔ اور پھر شراب پینے لگتی ہے اور خوب پیتی ہے اور پھر خاموش ہو جاتی ہے۔ جیسے اس کی ہستی نابود ہو گئی ہے۔ جب میں اپنے ہوٹل پہنچا تو روبن ابھی تک واپس نہیں آیا تھا اس کی کتاب بستر پر بعد از وصال محبوبہ کی طرح بکھری پڑی تھی۔ تھوڑی دیر میں نے اس کا انتظار کیا اور جب وہ نہ آیا تو میں سو گیا۔ جب میں صبح اٹھا تو روبن سویا ہوا تھا۔ اور کتاب اس کے سینے پر کھلی پڑی تھی۔ شاید وہ رات دیر تک پڑھتے پڑھتے سو گیا تھا۔ میں نے جلدی جلدی کپڑے بدلے، اسٹوو جلایا اور چائے بنائی، چائے روبن کے سرہانے رکھ کر میں نے اسے آواز دی۔ جب میں باہر جانے لگا تو اس نے آنکھ کھولی اور پکارا۔

"آج میں گلین جا رہا ہوں۔ تم شاید سیسل جاؤ گے اور ہاں ڈالی سے کہنا آج شراب کم پئے آج اسے مس شملہ کا تاج پہننا ہے۔" روبن نے کہا اور کروٹ بدل کر سو گیا۔

جب میں ڈالی کے ہوٹل پہنچا تو دروازہ بند تھا۔ میں نے دستک دی لیکن کوئی جواب نہ آیا۔ میں نے دھیرے سے دروازہ کھولا۔ وہ ابھی تک سوئی ہوئی تھی۔ اس کے سرہانے چائے ٹھنڈی ہو چکی تھی۔ فرش پر شراب کی بوتل، خالی گلاس، سگرٹ کے ادھ جلے ٹکڑے بکھرے پڑے تھے۔ دھوپ نکل چکی تھی۔ اور وہ مدہوش پڑی تھی شاید ابھی کچھ اثر باقی تھا۔ میں نے اسے کندھے سے ہلایا۔

"ڈالی اب جاگ بھی لو، بہت دیر ہو گئی ہے۔"

اس نے آنکھیں کھولیں اور بڑی مشکل سے بولی "آج کونسا دن ہے؟"

"اتوار اور آج تمہاری زندگی کا حسین ترین دن ہے! آج تمہیں مس شملہ کا خطاب ملنا ہے۔" میں نے اسے اٹھاتے ہوئے کہا۔

"مس شملہ برف کی رانی"۔ اس نے انگڑائی لی۔ فرش پر شراب کی بوتل، خالی گلاس اور سگرٹ کے جلے ہوئے ٹکڑوں پر اس کی نظر پڑی۔

"رات میں نے کتنی آگ انڈیلی جسم کے اندر، اور برف پگھلتی ہی نہیں" اس نے کہا۔

"تم خواب دیکھ رہی ہو۔" مجھے کچھ عجیب سا محسوس ہوا۔ ڈالی جو آواز، رنگ خوشبو دار آگ کا پیکر تھی خواب کی طرح ماورا بنتی جا رہی تھی۔

"اب تم تیار ہونا شروع کر دو۔ اور وقت پر پہنچ جانا۔ کل ہر اخبار میں پہلے صفحہ پر تمہاری تصویر ہو گی "مسز ڈالی وا ڈیا۔ مس شملہ" میں نے نعرہ لگاتے ہوئے کہا۔ ڈالی اٹھ بیٹھی، تھوڑی دیر بیٹھنے کے بعد میں واپس چلا آیا۔

دن بھر میں پریس کے کام میں مصروف رہا۔ شام کو سیسل پہنچا۔ ایک ہنگامہ تھا سارا شملہ جیسے سیسل میں امڈ آیا تھا۔ رنگ اور خوشبو کے پیکر گردش میں تھے۔ اور مس شملہ بننے کی امیدیں حسینائیں مارلن منرو بنتے بنتے رہ گئیں۔ روبن نے ٹھیک

کہا تھا کہ اس فیسٹیول کی سب سے بڑی خرابی یہ ہے کہ ماہرین جسم کے خد وخال، رنگ اور لباس کی تراش خراش پر حُسن کا فیصلہ کرتے ہیں اور کوئی بھی دل کے، اسٹیٹکس کا خیال نہیں رکھتا۔ اس دنیائے حسن وجمال میں میری آنکھیں ڈالی کو تلاش کر رہی تھیں، لیکن وہ ابھی تک نہیں پہنچی تھی۔ کیپٹن ملک اور مس پرمینا بھی آگئے تھے۔ انہوں نے پوچھا ڈالی کہاں ہے؟ "شاید آ رہی ہوگی۔" میں نے کہا اور وہ ڈائس کی جانب بڑھ گئے۔

ہر بار گھڑی کی سوئی جب ایک جھپ کے ساتھ ایک منٹ آگے بڑھتی، میری نگاہ دروازے کی جانب مڑ جاتی۔ شاید ڈالی آگئی لیکن ہر بار مایوس لوٹتی۔ پروگرام شروع ہونے میں صرف پندرہ منٹ باقی تھے۔ میں نے باہر جا کر دور تک نظر دوڑائی۔ لیکن ڈالی دکھائی نہ دی، کہیں اس نے پھر شراب نہ پی لی ہو اور نشے میں مدہوش پڑی ہو۔ لیکن وہ ایکدم اتنی شراب کیوں پینے لگی۔ جب ماہرین حسن بھی پہنچ گئے اور وہ نہ آئی تو میں پریشان ہو گیا۔

ڈالی کی تصویریں اور اس کے بارے میں فیچر اسٹوری جو میں کئی دنوں سے تیار کر رہا تھا، اس عالم رنگ وبو میں بکھرتی ہوئی نظر آئیں۔ میں اس کے ہوٹل کی طرف لپکا۔ راستہ بھر میں دیکھتا گیا، شاید وہ آ رہی ہو۔ اس کے ہوٹل پہنچ کر میں نے دروازے پر دستک دی، لیکن کوئی جواب نہیں ملا۔ دروازہ نیم وا تھا۔ میں اندر داخل ہوا۔ وہ کمرے میں نہیں تھی۔ شراب کی بوتل، خالی گلاس، سگرٹ کے ادھ جلے ٹکڑے، لپ اسٹک اور پاؤڈر فرش اور بستر پر بکھرے پڑے تھے میں نے باتھ روم میں دیکھا۔ وہ نہیں تھی۔ ہوٹل کے ہر کمرے میں تلاش کیا، وہ نہ تھی۔ منیجر سے پوچھا۔ اس نے بتایا کہ وہ سیسل گئی ہے۔ شاید وہ سیسل پہنچ گئی ہو۔ میں دوڑا دوڑا سیسل پہنچا۔ فیسٹی ول شروع ہو چکا تھا حسینائیں سجی سجائی اپنے حسن کی نمائش کر رہی تھیں۔

سارے ہال میں میری نگاہیں گھوم رہی تھیں، لیکن ڈالی نہیں تھی۔ میں ہارا ہوا ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ انتخاب میں حصہ لینے والی لڑکیاں ایک طرف بیٹھ چکی تھیں، مقابلہ

ختم ہو گیا تھا۔ اور ماہرین آپس میں مشورہ کر رہے تھے۔ تھوڑی ہی دیر بعد فیصلہ سنانے کے لئے جج صاحب سامنے آئے۔ ایک دم خاموشی طاری ہو گئی اور نگاہیں امید لئے ہمہ تن گوش تھیں۔ مس پرمیندرا کو مس شملہ کا تاج پہنایا گیا۔ اور ہال تالیوں سے گونج اٹھا مس پرمیندرا کی طرف لڑکے لڑکیوں کا دائرہ سمٹنے لگا۔ کیپٹن ملک اس کا ہاتھ اٹھا کر چلا رہے تھے "یہ سازش ہے پرمیندرا اور ملک کا، انہوں نے ڈالی کو رات سے شراب پلانا شروع کیا ہے اور معلوم نہیں اب وہ کہاں مدہوش پڑی ہو گی"۔ میں نے سوچا اور باہر آیا۔ ہال کے اندر سے تالیوں اور قہقہوں کی آوازیں آرہی تھیں۔

میں اپنے ہوٹل واپس آکر لیٹ گیا جیسے زندگی میں اب کچھ نہیں رہ گیا۔ مجھے شاید تنہائی کا احساس ہوا۔ کاش اس وقت روبن ہوتا۔ میرے ذہن میں روبن کی کئی تصویریں ابھرنے لگیں۔ لال شرٹ، نیلی جین پہنے نیم دراز کتاب پڑھتا ہوا روبن۔ سگریٹ کا دھواں اس کے گرد جال کی طرح لپٹتا چلا جا رہا ہے۔ میں نے چائے بنائی اور جب پینے لگا تو مجھے احساس ہوا کہ روبن کے ساتھ بیٹھ کر چائے پینے سے چائے کبھی تلخ اور کبھی شیریں ہو جاتی ہے۔ ایک ہی لمحہ میں روبن کی عمر بدل جاتی ہے۔ کبھی وہ ایک معصوم بچے کی طرح چشم حیرت سے آپ کی طرف دیکھنے لگتا ہے اور پھر دوسرے لمحے وہ ایک نوجوان بہ مثلِ سیالِ آتش بن جاتا ہے۔ اور پھر ایکدم اپنی ٹھوڑی کے نیچے کتاب رکھ کر گوتم بدھ بن جاتا ہے چائے کی پیالی خالی پڑی تھی۔ ایش ٹرے میں سگریٹ کے جلے ہوئے ٹکڑے پڑے رہتے۔ سامنے دیوار پر مائیکل اینجلو کی "آدم کی تخلیق" آویزاں تھی اور میں جیسے معدوم ہو رہا تھا۔ میں گھبرا کر باہر نکل آیا اور سڑک پر بے مقصد بہنے لگا۔ میں ڈھلان پر نیچے اور نیچے پھسلتا جا رہا تھا۔ میں اس وقت چونکا جب مجھے احساس ہوا کہ میں گلین میں ہوں۔ پتھروں پر پھسلتا ہوا پانی دھیرے دھیرے بہہ رہا تھا۔ ایک سناٹا تھا، مکمل سکوت، سورج غروب ہو رہا تھا۔ گلین میں تاریکی کے سائے بڑھ رہے تھے۔ جیسے چٹانیں اوپر اٹھتی جا رہی ہوں۔ میری نگاہیں روبن کو تلاش کر رہی تھیں۔ دور پتھر پر مجھے کتاب کے اوراق اڑتے نظر آئے۔ ظاہر ہے روبن اس کے قریب کہیں ہوگا۔ پتھر کے پیچھے

مجھے روبن کا چہرہ دکھائی دیا۔ میں دھیرے دھیرے قدموں سے اس کی طرف بڑھا۔ مجھے ایک دم خیال آیا کہ چپکے سے اس کے پیروں میں جا کر بیٹھ جاؤں اور پوچھوں "دیکھو گورو دیو نروان پراپت ہو گیا۔" جب میں چٹان پر کھڑے ہو کر نیچے جھکا تو ششدر رہ گیا۔ بدھ کے سینے پر سر رکھے اجنتا کی تصویر سگریٹ پی رہی تھی۔

بجلی کا کھمبا

چند روز ہوئے ہوٹل کے مالک نے ایک شام مجھ سے کہا ہمیں جینیس نہیں چاہئے مسٹر اور تم تو سوپر جینس ٹھہرے۔ شاعر اور کہانی کار ہمیں تو وہ آدمی چاہئے جو مشین کی طرح تیز رفتاری سے کیلکولیٹر پر روپے پیسے کے بل بنا سکے۔" پھر وہ مسکرایا" اور تم ہینڈل پر ہاتھ رکھے سوچتے رہتے ہو کہ آدمی اور مشین میں کیا رشتہ ہے۔ پھر وہ زور سے ہنسا" سنا ہے امریکہ میں اب مشینیں بھی شعر کہنے لگی ہیں"۔

"آدمی اور مشین میں کیا رشتہ ہے؟ یہ سوچنے کی ضرورت نہیں کیوں کہ میں آدمی ہوں اور مشین پر کام کرتا ہوں لیکن میری جگہ یہ کم دام پر مشین کی طرح چست اور تیز رفتاری سے کام کرنے والے آدمی نے لے لی"۔

اس آدمی نے میری طرف ایک بار دیکھا اور پھر کھٹ کھٹ کیلکولیٹر پر بل بنانے لگا۔

اب میں کئی دنوں سے سڑکوں کی خاک چھان رہا ہوں۔ نوکری نہیں ملی اور نہ شعر ہی کہہ سکا اور نہ کوئی کہانی لکھ سکا۔ واقعی یہ پہلا دور پہیے کی گڑگڑاہٹ کا ہے دل کی دھڑکن کا نہیں آدمی یا تو مشین بن جائے ورنہ .... اب تو کوئی استعارہ بھی نہیں سوجھتا میرا جسم شل ہو گیا ہے۔ دماغ سوچ نہیں سکتا اور دل بھر گیا ہے۔ بس ایک روشنی ہے جو میرے سر پر ہے۔ ایک سلسلہ ہے روشنی کا جو سڑک کے ایک کنارے سے دوسرے کنارے تک پھیلتا چلا گیا ہے۔

بات بہت معمولی تھی اور اس قسم کی باتیں کاروباری زندگی میں روزمرہ

کا معمول بن چکی ہیں۔ لیکن نامعلوم کیوں میرا دل بھر گیا اور میں کتنی دیر سے بجلی کے کھمبے کے ساتھ کھڑا ہوں۔ جب میں زندگی میں کبھی مایوس ہوتا ہوں تو کسی درخت کی جھاڑی میں یا دیوار کے سائے میں کھڑا ہو جاتا ہوں خاموش بے حس بے حرکت اور اس وقت تک کھڑا رہتا ہوں جب تک دل کا درد اور سائے کی سیاہی ایک دوسرے میں خلط ملط ہو کر میرے احساس کو سن نہیں کر دیتے لیکن اس بار مایوس ہونے کے بعد میں درخت کی چھاؤں یا دیوار کے سائے کے بجائے بجلی کے کھمبے کے ساتھ اس کی روشنی تلے کھڑا ہو گیا۔ اس روشنی میں میں نے اپنے آپ کو اندھیرے کی لاوارث لاش کی طرح محسوس کیا کہ یہ میری آخری شکست ہے۔ اس لئے نہیں کہ اس کے بعد میں کامیاب ہو جاؤں گا۔ بلکہ اس لئے کہ اس کے بعد کسی قسم کی جدوجہد میں بیکار سمجھتا ہوں۔ اگر بجلی کا بلب بولنے نہ لگتا تو میرا یہ احساس تیز ہو جاتا کہ میں اندھیرے کی لاوارث لاش ہوں جسے روشنی کی بھٹکی ہوئی لہروں پر بہا دیا گیا ہے۔

"مجھے معلوم تھا کہ ایک دن تم ضرور آؤ گے"۔ بجلی کے بلب نے کہا میں نے تمہیں کئی بار ان سڑکوں پر رات گئے تک گھومتے ہوئے دیکھا ہے۔ تم نے کبھی میری طرف نظر اٹھا کر نہیں دیکھا شاید تمہیں میری مصنوعی اور بیمار روشنی سے نفرت ہے۔ مجھے یاد ہے کہ ایک بار میری طرف دیکھ کر تم نے کہا تھا قمقموں کی زہر اگلتی روشنی۔ میں نے برا نہیں مانا۔ اسلئے کہ میں نے اسی سڑک کے کنارے رات رات بھر جاگ کر زہر پیا ہے۔ اگلا نہیں، تم ہمیشہ چاند ستاروں کی طرف دیکھتے رہتے تھے۔ اور دھیرے دھیرے کچھ گنگناتے رہتے تھے۔ تمہاری قمیض کے بٹن کھلے ہوتے تھے۔ تم اس وقت چونکتے جب کسی برق رفتار کار کی تیز روشنی تمہاری نظر چاند ستاروں سے ہٹا کر میرے قریب لے آتی تھی۔

ہوتے ۔ میں نے تمہیں دن میں کبھی نہیں دیکھا۔ تم کیا کرتے ہو۔ کیسے گھومتے ہو۔ کیونکہ میں دن میں بجھ جاتا ہوں لیکن تم کچھ نہ کچھ، تو ضرور کرتے ہی ہو گے تو زندہ رہنے کے لئے ہر آدمی کو زندہ رہنے کے لئے کچھ نہ کچھ کرنا پڑتا ہے۔

پھر میں نے دیکھا تم نے گنگنانا بند کر دیا۔ بس صرف چاند ستاروں کی طرف۔ اداس
نظروں سے دیکھتے رہتے ہو۔ پھر تم نے چاند ستاروں کی طرف دیکھنا بند کر دیا۔ تمہاری
گردن جھک گئی اور تم اپنے پاؤں کی ٹھوکر سے ایک چھوٹے سے پتھر کو لڑھکاتے لئے جا رہے
تھے۔ اور جب تم واپس آئے تو وہی پتھر تمہارے پاؤں کی زد میں تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ تم
کسی غم میں مبتلا ہو۔ اگر دن کو تم ایسا کرتے تو مجھے کچھ محسوس نہ ہوتا۔ دن کو میں اندھا ہو
جاتا ہوں لیکن رات کو میری تیسری آنکھ کھل جاتی ہے پھر تمہیں یاد ہوگا ایک دن تم آئے تمہارے
قدم ڈگمگا رہے تھے۔

تم کوئی غزل اونچے سروں میں گا رہے تھے۔ لیکن کبھی سڑک کے اس کنارے اور کبھی اس
کنارے تمہارے بال الجھے ہوئے تھے۔ چہرے پر فکر کے آثار تھے تمہارے ہاتھوں میں کاغذوں کا
پلندہ تھا جسے تم نے حقارت سے ڈسٹ بن میں پھینک دیا اور پھر خوب ہنسے تم نے شراب
پی رکھی تھی۔ میں اس غم سے بجھ گیا۔ مجھے احساس ہوا کہ تم اب ہمیشہ اس طرح آؤ گے اور اگر
تمہیں شراب میسر نہ ہوئی تو تم بجھ جاؤ گے۔

تم نے شراب اس لئے پی کہ اپنے غم کو بھول جاؤ اور تمہیں شراب اس کے بعد میسر نہ ہوئی۔
اس لئے نہیں کہ تم لال پری کو شیشے میں نہیں اتار سکے بلکہ اس لئے کہ تم خون جگر شیشے میں اتارنے
کے قائل تھے۔ کیونکہ میں نے تمہیں ڈسٹ بن میں اپنی کہانیوں اور نظموں کے مسودے ڈھونڈتے
دیکھا اور جب تمہیں مایوسی ہوئی تو تم میرے قریب آ کھڑے ہوئے ....“
بجلی کا بلب یہ کہہ کر کچھ لمحے کے لئے خاموش ہو گیا۔ سڑک پر تیزی سے کوئی کار نکل
گئی۔

”تم سوچتے ہو گے میں لوہے اور شیشے کا مرکب یہ سب باتیں کیسے محسوس کر لیتا
ہوں“۔ بجلی کے بلب نے کہنا شروع کیا ”یہ صحیح ہے کہ لوہے کے کھمبے سے لگ کر روشنی دیتا
ہوں جسے تم مصنوعی اور بیمار سمجھتے ہو۔ لیکن اس کھمبے کے ساتھ لوگ آ کر کھڑے ہوتے
ہیں۔ ڈھلتے ہوئے جسم اور ڈوبے ہوئے دل لئے میں نے ہر رات غم زدہ لوگوں کے دل
کی دھڑکن سنی ہے۔ مجھ میں بھی انسانی احساسات کو محسوس کرنے کی کچھ قوت پیدا ہو گئی

ہے۔ یہی باعث ہے کہ میں سمجھ گیا کہ تمہارے جیسا آدمی رو نہیں سکتا۔ یہی تمہاری ٹریجڈی ہے کہ تم رو نہیں سکتے۔

آدمی کتنا بھی غمزدہ کیوں نہ ہو اگر وہ تنہا ہے تو وہ اپنے درد کے احساس سے مرجائے گا۔ لیکن روئے گا نہیں۔ رونے کے لئے بھی کسی غم خوار کی ضرورت ہوتی ہے۔

آدمی کسی پیار بھرے ہاتھ کا لمس پا کر ایک دم پھوٹ پڑتا ہے۔ رونا بہت ضروری ہے ورنہ دل پھٹ جاتا ہے۔ اور پھر کوئی آنسو ستارہ بن کر چمک نہیں سکتا کوئی درد گیت میں نہیں ڈھل سکتا کوئی زخمی انگلی ستار پر نہیں تھرک سکتی۔ میں شاعر نہیں بجلی کا بلب ہوں۔ اور تمہیں کسی پیار بھرے ہاتھ کا لمس چاہیئے۔ میرے ہاتھ نہیں دور دور تک پھیلی ہوئی یہ تاریں ہیں جن کا لمس زندگی نہیں موت دیتا ہے۔ میرے دوست میں سرد لوہے کے کھمبے سے کسی پیار بھرے ہاتھ کا نعم البدل نہیں بن سکتا۔ لیکن اپنی اس جلتی بجھتی روشنی سے تمہاری باتیں سمجھ سکتا ہوں میرے اور قریب ہو جاؤ تمہیں شاید کوئی خوشی نصیب نہ ہو گی۔ لیکن مجھے انسان کی قربت حاصل ہو جائے گی۔“

بجلی کا بلب پھر ایک لمحے کے لئے خاموش ہو گیا۔ میں اس کے قریب ہو گیا لوہے کے کھمبے سے لپٹ کر مجھے عجیب زندگی کا احساس ہوا۔

”جب میرے ساتھ لگ کر کوئی کھڑا ہوتا تو مجھے عجیب زندگی کا احساس ہوتا ہے۔“ بجلی کے بلب نے کہنا شروع کیا۔ ”کچھ دن ہوئے تمہاری طرح ہی ایک بجھے ہوتے دل والی ایک لڑکی میرے قریب کھڑی ہو گئی۔ اس کی آنکھوں میں آنسو تھے وہ ابھی رو سکتی تھی۔ اس سڑک پر شام کے جھٹپٹے میں اسے چہل قدمی کرتے ہوئے میں نے کئی بار دیکھا ہے۔ اس کے ننھے ننھے سفید ہاتھوں میں سلائیوں کو ناچتے دیکھ کر عجیب خوشی کا احساس ہوتا تھا۔ کتنی تیزی اور صفائی سے اس کے ہاتھ سوئٹر بن رہے تھے۔ کبھی کبھی سرد راتوں میں تنہا کھڑے کھڑے میری خواہش ہوتی کہ وہ لڑکی مجھے سوئٹر پہنا دے۔ اور میں اسے ہمیشہ روشنی دیتا رہوں گا۔ پھر ایک روز اسے بھی کسی نے لڑکھڑاتے ہوتے قدموں سے گھر جاتے دیکھا۔ کئی راتیں وہ اس

سڑک سے کبھی ٹیکسی اور کبھی موٹر رکشا پر گزرنے لگی اور بہت دور کہیں تیز روشنی میں اندھیرے کی طرح گم ہو جاتی۔ شاید جب وہ منہ بند کلی سی چٹکنے لگی تو کسی نے توڑ دیا یا مسل دیا یا اس کو اپنے دل میں چھپانے والے اور اس کے درمیان کوئی دیوار حائل ہو گئی میں نہیں جانتا اس پر کیا بیتی اسے چھوئی موئی سمجھ کر حفاظت سے رکھا گیا تھا کہ وہ چھونے سے ہی مرجھا گئی۔ یا اسے کاغذ کے پھول کی طرح ہر ہاتھ میں لٹنے دیا تھا۔ یا اس نے خود سپردگی کی اور اسے فریب ملا یا اس نے پیار کیا اور اس کی سزا ملی لیکن اتنا جانتا ہوں کہ اس کے ماں باپ بوڑھے ہیں جب وہ جوان تھے بیٹی کی پرورش کرتے تھے۔ اور جب بیٹی جوان ہوئی تو ماں باپ کی پرورش کرنے لگی۔ میں نے اس سڑک پر اس کے گرد بیمار جسم اور بے رحم ہاتھ لپٹتے دیکھے۔ اب اس کا جسم بھی بیمار ہے روح اپاہج ہے دل زخم خوردہ ہے وہ بھی تمہاری طرح قبل از وقت بڑھاپے کی دہلیز پر کھڑی دستک دے رہی ہے۔ ایک بار وہ بہت دکھی تھی۔ میرے قریب کھڑی ہو گئی میں نے اس سے کہا ہاتھ ہاتھ ہی ہوتے ہیں۔ بیمار کا ہو یا کسی تومند کا۔ تمہیں ان ہاتھوں کے لمس سے روپیہ ملتا ہے۔ اور روپیہ زندگی کے لئے ضروری ہے۔ پیار اور حسن روپے کے بغیر فریب محض ہے اس نے میری طرف انتہائی دکھ سے دیکھا ہاں ہاتھ ہاتھ ہی ہوتے ہیں۔ میں ان کے ہاتھ کا لمس چاہتی ہوں جن میں روح پھسل کے آجاتی ہے۔ دل تحفے کے روپ میں آتا ہے اور ... اور وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

بجلی کا بلب بجھ گیا سب بلب بجھ گئے۔ چاروں طرف اندھیرا چھا چکا تھا۔ اس اندھیرے میں بھی وہ کہہ رہا تھا۔ تمہارے پاس وہ ہاتھ ہیں۔ اب یہی ہیں میرے دوست۔ وہ لڑکی رات میں ہاتھوں کی تلاش میں یہاں آئی تھی۔ اور مجھ سے لپٹ گئی تھی۔ وہ تمہارے ہاتھوں کی تلاش میں ہے۔ اور تمہارے ہاتھ... کیا نام لیا تھا اس لڑکی کا۔ ہاں نشا کی تلاش میں ہیں اور نشا ماں باپ کی تجوری میں بند ہے۔ اور یہ لڑکی ماں باپ کی تجوری ہے سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ کیا ہو رہا ہے۔ تم انسان ہو اس دنیا کے باسی ہو یہ کیا ہو رہا ہے۔ میں جانتا ہوں۔ تمہیں تجوری سے نفرت ہے۔ لیکن زندگی تجوری کے بغیر جرم ہے۔ یا موت ابھی کل ہی کا ذکر ہے۔ ایک چودہ سالہ بچے کی خودکشی کا وہ بچہ ہر رات میری روشنی میں

تواریخ، جغرافیہ، اکنامکس اور شاعری کی کتابیں پڑھا کرتا تھا۔ رات گئے تک وہ یہاں پڑھتا تھا۔ میں نے اس سے پوچھا "بیٹے تم اپنے گھر کیوں نہیں پڑھتے۔ اس نے میری طرف حسرت بھری نظر سے دیکھا گھر میں اندھیرا ہے"۔ "دیا جلا لو"۔ "پیسے نہیں" میں خاموش ہو گیا۔ جس کی اپنی رگوں میں خون جل جل کے خشک ہو رہا وہ تیل جلانے کے لئے پیسے کہاں سے لاتے۔ سامنے والے مکان کی کھڑکی میں دیکھو کتنی کم روشنی ہے۔ اور آرام کرسی پر بیٹھی لمبے بالوں والی لڑکی ہنگری ہل پڑھ رہی ہے۔ اس نے ایم۔ اے کر لیا ہے۔ یونیورسٹی کی بس میں جاتی تھی۔ اب سوشل آرگنائزر ٹریننگ کے لئے امریکہ جا رہی ہے۔ اور اس آفیسر کے ساتھ کلبوں میں گھومتی ہے۔ جس نے اسے امریکہ جانے کے لئے پاس کیا ہے۔ اور وہ بچہ میری روشنی میں پڑھ کر اپنی آنکھ کی روشنی بھی کھو رہا ہے جب اسے دن کے اجالے میں بھی کچھ دکھائی نہیں دے گا تو اسے کام نہیں ملے گا۔ جب اسے کام نہیں ملے گا تو وہ مر جائے گا۔۔۔ لیکن وہ سمجھدار بچہ تھا، پیشتر کے اسے موت آئے وہ خود ہی مر گیا۔

جب اس کا امتحان شروع ہوا تو اس کا باپ دمے سے مر گیا۔ اور وہ ناکام ہو گیا۔ اب وہ کبھی نہیں پڑھ سکے گا۔ پڑھے بغیر اسے کام نہیں ملے گا۔ اور گھر میں ایک بوڑھی ماں اور جوان بیٹی ہے۔ وہ ہار گیا اور اس نے کچھ کھا لیا۔ اس کی ماں نے برتن صاف کرنے کا کام شروع کر دیا۔ لیکن وہ پاگلوں کی طرح حرکت کرنے لگی۔ اور کام نہ کر سکی۔ اگر وہ پاگل نہ بنتی تو عورت نہ ہوتی۔

اس کی بیٹی کسی کے ساتھ بھاگ گئی جس کے ساتھ وہ بھاگ گئی تھی قانون نے اسے اغوا کے جرم میں جیل میں بند کر دیا۔ جب وہ جیل سے رہا ہوا تو وہ رات کے اندھیرے میں تجوری توڑنے لگا۔ اور اب سایہ دیواریں رقم گنتا ہے۔ میں نے اس سے ایک بار پوچھا تھا تم نقب زنی کیوں کرتے ہو۔۔۔ جانتے ہو اس نے کیا جواب دیا تھا۔ ہر آدمی نقب زنی کرتا ہے کوئی رات کے اندھیرے میں اور کوئی دن کے کالے بازار میں پھر وہ میرے قریب آ گیا۔ تم لوہے کے کھمبے ہو اس نے کہا تم انسان کے دل کی بات نہیں۔

سمجھ سکتے ہیں نے بھی پیار کیا تھا۔ محنت مشفقت کی تھی۔ لیکن قانون نے مجھے اغوا کے جرم میں بند کردیا۔ اب میں صرف روپے سے پیار کرتا ہوں جہاں بھی بس چلے اغوا کر لیتا ہوں۔ وہ میرے ساتھ لگ کر کئی گھنٹے کھڑا رہا اور میں اس کے دل کی آواز سنتا رہا۔

بجلی کا بلب ایکدم روشن ہو گیا۔

تم سوچتے ہو گے میں بجھ کیوں گیا تھا۔ مجھ میں اتنی ہمت نہیں کہ انسانوں کے دکھ درد کی بات روشنی میں کہہ سکوں لیکن میری بات کچھ الجھ گئی ہے۔ بات یہ تھی کہ وہ بچہ اس لڑکی کا بھائی ہے جو یہاں آ کر روئی تھی۔ وہ نقب زن اس کا محبوب تھا جس نے اس کھمبے کے ساتھ کھڑے ہو کر سامنے والے مکان میں چوری کا ارادہ کیا تھا۔ اور سامنے والا مکان اس لڑکی کا ہے جو امریکہ جا رہی ہے۔ اس لڑکی کا بھائی ہی تھا جس نے پہلی بار اس لڑکی کو پیسے دیکر جسم کا سودا کیا اور اس کی روح تک زخمی کر دی"۔

بجلی کے بلب کی روشنی اور زیادہ تیز ہو گئی۔ سنا ہے تم کہانی کار ہو۔ تمہارے چہرے پر غم کی پرچھائیاں ان سب لوگوں کے دکھ کے باعث ہیں۔ خوشی کے لئے روپیہ شہرت اور عورت کا پیار چاہیئے۔ جس سے تم محروم ہو گئے ہو گئے ہو۔ روپیہ شہرت اور عورت کا پیار سرکار کے دربار سے کسی سیاسی پارٹی کے تاریک ذہن سے کالے بازار کے اندھے کنوئیں سے ملتا ہے لیکن جب تک تم کہانی کار ہو تمہیں کچھ نہیں مل سکتا کچھ بھی نہیں۔ دل کا چین اور روح کی شانتی بھی نہیں۔ خوشی کے لئے ضمیر کی آواز کو دبا دینا پڑتا ہے۔ اور کہانی تو ضمیر کی آواز ہوتی ہے۔

میں نے بجلی کے بلب کی طرف پہلی بار نظر اٹھا کر دیکھا۔ وہ مسکرایا۔ یہ کہانی دن کی نہیں رات کی ہے۔ میں رات بھر جاگتا رہتا ہوں۔ شاید تم بھی رات بھر جاگتے رہتے ہو۔ ان ہی سڑکوں پر میں روشنی دیتا ہوں اور رات میں سڑکوں پر تم روشنی کی تلاش کرتے ہو۔ میں سیاہ اور سخت، کوئلے کے سینہ سے گرمی اور روشنی کی چنگاری

بن کر پھوٹتا ہوں۔ اور تم انسانی دنیا کی سیاہی سے گھبرا کر بجھ رہے ہو۔"
بجلی کا بلب خاموش ہو گیا اور میں نے محسوس کیا کہ میرا ایک ہاتھ نقب زن کے ہاتھ میں ہے۔ اور دوسرا اس لڑکی کے ہاتھ میں۔ اور میں ان دونوں کے ساتھ بجلی کے ایک بلب سے دوسرے بلب پر اچھلتا کودتا ستاروں کی محفل میں پہنچ گیا ہوں۔ جہاں وہ بچہ ہمارا انتظار کر رہا ہے اور جہاں ہر ٹوٹتے ہوئے ستارے سے ایک کہانی جنم لیتی ہے۔

میں، وینس اور دو ہاتھ

شام کے سائے دھیرے دھیرے بڑھنے لگے۔ سورج سامنے مکان کے عقب میں چھپ گیا ہے مکان کا سایا گلی میں پھیل گیا ہے۔ درختوں کے سائے باغ دیوار پر اور دیوار کا سایا سامنے مکان کی دہلیز پر سو رہے ہیں۔ پوری سڑک پار کر کے بجلی کے کھمبے کا سایا پانی کے نل کے سائے سے ہمکنار ہو کر سو چکا ہے ڈوبتا سورج تھوڑی دیر کے لئے پھر چمکا۔ جب وہ دور پہاڑوں کی چوٹیوں سے ہو کر ان کے پیچھے دھیرے دھیرے پھیلنے لگا۔ ان کے ارد گرد لال روشنی کے شعلے بکھرنے لگے۔ اور سفید بادل سرخی مائل ہو گئے۔ روشنی جتنی تیز تھی اندھیرا اتنا قریب تھا۔ دھیرے دھیرے روشنی مٹنے لگی۔ اندھیرا بڑھنے لگا۔ ہوا کا جھونکا زیادہ تیز اور سرد ہو گیا تھا۔ میں کرسی اٹھا کر اندر آ گیا۔ میرے پیچھے سڑک کے بلب روشن ہو چکے تھے۔

میں نے کمرے میں روشنی کی اور بستر پر نیم دراز ہو گیا۔ سامنے کارنس پر وینس کا بت پڑا تھا۔ میرے سرہانے میز پر ایش ٹرے، کتاب اور گلاس میں مرجھائے ہوئے پھول پڑے تھے۔ بغل والی دیوار پر امرتا شیرگل کی سیلف پورٹریٹ تھی۔ میں نے اسٹوو پر چائے کی کیتلی رکھ دی۔ اس گم سم خاموش تنہائی میں اسٹوو کی آواز زندگی کا عجیب احساس دیتی ہے۔ اور اگر باہر بارش ہو رہی ہو اور کمرے میں اسٹوو جل رہا ہو تو ایک THRILL ایک مہم سر کرنے کی خوشی ہوتی ہے۔ جب تک اسٹوو جلتا رہتا ہے میں اس کی آواز میں گم سم کچھ نہ کچھ سوچتا رہتا ہوں۔ شاعری، فلسفہ، آرٹ، پیار کی کچھ بھولی بسری یادیں۔ اور کچھ نئے پرانے سپنے۔ لیکن جونہی اسٹوو بجھتا ہے

مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے زندگی کی روح، گرمی اور روشنی ایک دم مر گئی ہو اور کمرہ میں وینس کا ٹوٹا ہوا بت ہوں یا ایش ٹرے ہوں۔ یا مرجھائے پھولوں کی بکھری ہوئی پتیاں ہوں۔

چائے پیتے پیتے مجھے اسی طرح کے عجیب خیال آتے ہیں۔ کبھی کبھی مجھے محسوس ہوتا ہے کہ میں جسمانی طور پر ہی نہیں بلکہ ذہنی طور پر بھی مریض ہوں۔ شاید اب نارمل ہوں یا کوئی عظیم آرٹسٹ۔ میں سوچتا ہوں کہ اگر خدا بچے کو عورت کے بطن کے بجائے انسان کے ذہن میں پرورش پانے دے اور پیدا ہونے سے پہلے اس سے پوچھے کہ کیا وہ پیدا ہونا چاہتا ہے تو اس دنیا میں کسی بچے کا ظہور نہیں ہو سکتا۔

میں کچھ تھک سا گیا ہوں۔ میں نے روشنی بجھا دی۔ چاہتا ہوں سو جاؤں۔ سو نہیں سکتا اور اتنی سکت نہیں کہ رات بھر جاگتا رہوں۔ سونے اور جاگنے کی اس کشمکش میں کب آنکھ لگتی ہے۔ کب کھلتی ہے۔ ایک معمہ ہے سمجھنے کا نہ سمجھانے کا۔

اس اندھیرے میں دو ہاتھ بڑھتے ہیں۔ اور وینس کے بت کو اپنی نرم نرم انگلیوں میں تھام لیتے ہیں۔ ٹک ٹک کمرے میں آوازیں آنے لگتی ہیں۔ جیسے پتھر پر ہتھوڑے سے چھینی ماری جا رہی ہے۔ اندھیرے میں ہاتھ حرکت کرتے رہتے ہیں اور ٹک ٹک کی آوازیں جاری رہتی ہیں۔ اچانک کمرے میں روشنی کا غبارہ پھوٹتا ہے۔ وینس مسکرا رہی ہے اس کے دونوں ہاتھ صحیح و سالم ہیں۔ وہ جھک کر فضا میں حرکت کرتے ہوئے ہاتھوں کو چوم لیتی ہے۔ جونہی وینس کے ہونٹ ان ہاتھوں کو چومتے ہیں زور کا دھماکا ہوتا ہے۔ چاروں طرف دھواں ہی دھواں۔ اندھیرا ہی اندھیرا پھیل جاتا ہے۔ چھت کی کڑیاں ٹوٹتی ہیں۔ اینٹیں فرش پر گرتی ہیں۔ وینس کا بت، ہاتھ اور میں سب اس ملبے کے ڈھیر کے نیچے دب جاتے ہیں۔ میں زور زور سے کراہتا ہوں، چیختا ہوں، چلاتا ہوں لیکن مجھے ماسوا میرے اور کوئی میری آواز نہیں سنتا۔ مجھے بس ایسا محسوس ہوتا ہے کہ میرے جسم کے اوپر جیک بوٹوں میں سنگین لگی بندوقیں لیفٹ رائٹ کر رہی ہیں۔

پہلے گولی کی آواز آتی ہے، پھر چیخ کی، پھر قہقہے کی اور پھر جیسے سارے عالم کے کتے بھونکنے لگتے ہیں۔ اور میں ملبے کے ڈھیر کے نیچے، جیک بوٹ اور سنگین لگی بندوقوں کے نیچے

گولی، چیخ، قہقہے اور کتوں کی آوازوں میں گھرا سسک سسک کر دم توڑنے لگتا ہوں۔
یہ مردوں کی بستی ہے۔ یہاں ہر چیز سیاہ ہے۔ رات سیاہ ہے، آسمان سیاہ ہے۔ تارے
سیاہ ہیں، چاند سیاہ ہے، بجلی کے بلب سیاہ ہیں۔ چہرے سیاہ ہیں۔ روحیں سیاہ ہیں۔ راستے منزل
لوگ قافلے سب سیاہی میں ڈوبے ہوئے ہیں۔ اگر کہیں روشنی ہے تو اس الاؤ کی جس کے
گرد مردہ روحیں ناچ رہی ہیں۔ ننگی، بے ڈول، سیاہ۔ اچانک میرے کندھے پر کسی
نے نرمی سے چھوا۔

"فکر مت کرو دوست۔ اس عالم فانی میں کوئی شے ایسی نہیں جس کی قسمت میں
فنا ہونا نہ لکھا ہو۔" اندھیرے میں آواز ابھری۔

"تم کوئی فلسفی معلوم ہوتے ہو۔" میں نے پوچھا۔

"نہیں۔ میں آرٹسٹ ہوں۔ دنیا میں صرف تین آرٹسٹ ہوئے ہیں۔ خدا، عورت
اور میں۔"

"خدا نے عورت کی تخلیق کی۔ عورت نے مجھے جنم دیا۔ اور میں نے خدا کو۔"
آواز تھوڑی دیر کے لئے رکی۔ "جانتے ہو جس ملبے کے نیچے ہم پڑے ہیں۔ یہ تہذیب
کے کھنڈر ہیں۔ اور جس الاؤ کے گرد بھوت ناچ رہے ہیں۔ اس میں سنہری الفاظ سیاہ
لوبے میں ڈھل رہے ہیں۔ اور یہ ناچتے ہوئے بھوت ان لوگوں کے ہیں جو کل پرسوں
اور اس کے بعد آنے والے دن کو مرنے والے ہیں۔"

آواز کچھ دیر کے لئے رک گئی۔ میرے شانے کو کسی نے جھنجھوڑا۔ "اٹھو دوست۔
کب تک یوں مردہ پڑے رہو گے۔" آواز نے مجھے سہارا دیکر کھڑا کر دیا۔

میں نے سہارا دینے والے ہاتھوں کو دیکھا جو ہاتھ میرے کمرے میں وینس کے
بت کو بازو عطا کر رہے تھے انہیں ہاتھوں نے مجھے کھڑے ہونے کی قوت عطا کر دی تھی۔

"لو اسے کندھے پر اٹھاؤ اور میرے پیچھے پیچھے چلے آؤ۔ اس منزل تک جہاں مسیح صلیب
پر چڑھتا ہے۔"

ان دو ہاتھوں نے میرے کندھے پر صلیب رکھدی اور میں پیچھے پیچھے چلنے لگا۔ میں

مسلسل چل رہا ہوں۔ مجھے چلتے چلتے ہزاروں صدیاں بیت گئی ہیں۔ میں اس صلیب کی پتوار کے سہارے دریاؤں کے سینے چیر کر اس پار پہنچا ہوں جہاں لوگ کہتے ہیں آنندلا کا شہر ہے اور اسی صلیب کے سہارے میں بلند چوٹیوں کو پار کر کے دوسری جانب پہنچا تھا جہاں لوگ کہتے ہیں روشنیوں کا شہر ہے۔ لیکن نہ کوئی آرزو پوری ہوئی اور نہ کوئی روشنی نظر آئی بلکہ میرے کندھے پر صلیب کا نشان گہرا ہوتا چلا گیا۔

"اے سدا بہار پھول! کہاں جا رہے ہو تم؟" میرے کانوں میں کسی نے کہا۔

مجھے سدا بہار پھول کس نے کہا۔ میں چونکا۔ ایک تتلی میرے چہرے کے پاس اڑ رہی تھی۔ اس کے پروں کا صد رنگ سیاہ پڑ چکا تھا۔ اس کے پروں میں گلاب کے پھول کا کانٹا چبھا ہوا تھا۔"

"تم کون ہو" میں نے پوچھا۔

"تمہاری آرزو۔ میں تو صدیوں سے تمہارے ساتھ چل رہی ہوں"۔ وہ تھوڑی دیر کے لئے رکی۔" لیکن میں ہمیشہ سے ایسی نہیں تھی۔ میرے پروں میں قوس و قزح کے رنگ تھے اور میری پرواز ستاروں تک تھی۔ لیکن ...."

تتلی میرے کندھے پر رکھی صلیب پر بیٹھ گئی شکستہ آرزو باتیں کرنے لگی۔

جب اندھیرا بہت گہرا ہو گیا تو میں رک گیا۔

"اندھیری رات کے مسافر چلتے چلو"

میں نے سوالیہ نشان سے آواز کی جانب دیکھا۔

"میں رات ہوں بیٹا۔ تیرا نصیب۔ میری اوڑھنی میں تارے ٹنکے ہیں۔ اور میرے ماتھے پر چاند جھومر ہے۔ لیکن پھر بھی میں رو رہی ہوں۔ یہ آنسو ان شکستہ دل لوگوں کے ہیں جو رات رات بھر میرے ذہن میں چھپ کر روتے ہیں۔ لوگ ان آنسوؤں کو شبنم کہتے ہیں۔ ٹھیک ہے ٹھیک ہے یہ رات کو برستے ہیں اور دن کے اجالے میں مر جاتے ہیں۔"

موتیوں میں ڈھلتے ہوئے آنسوؤں کی بوندیں صلیب پر بکھر گئیں اور میں

آگے بڑھ گیا لیکن اندھیرا اتنا گہرا تھا کہ میرے قدم آگے نہیں بڑھ رہے تھے۔ میں نے ادھر ادھر دیکھا۔ میرے چاروں طرف دیواریں تھیں۔ اونچی اونچی۔ ان میں نہ کوئی دروازہ تھا۔ نہ کھڑکی۔ نہ روشندان۔ نہ کوئی سوراخ۔ میں نے باہر نکلنے کی ہزار کوشش کی، لیکن ناکام رہا۔ مجھے ایسا محسوس ہوا کہ میں ایک چوہا ہوں، جس کا بل بند کر دیا گیا ہے۔ میں کبھی ایک دیوار سے ٹکراتا ہوں کبھی دوسری سے۔ لیکن راہ فرار کوئی نہیں تھی۔ صلیب کے بوجھ تلے کئی بار گرتا، اٹھتا، سنبھلتا پھر گرتا میں چوہے کی طرح زمین کے اندر ہی اندر چل رہا تھا۔ صلیب پر سیاہ الفاظ دھوئیں میں چنگاری کی طرح اڑنے لگے۔

"There is no exit now" میں ایک لمبی سرنگ میں چل رہا ہوں۔ لیکن وینس کا بت ابھی بہت دور تھا۔ راستہ سانپ کی مانند میرے جسم پر لپٹا جا رہا تھا۔ موت کو اتنے قریب پا کر میں چیخ اٹھا۔ لیکن یہ چیخ مرنے والے آدمی کی نہیں نوزائیدہ بچے کی تھی۔ زندگی جیسے میری پسلی میں تحرک رہی ہو۔ میں چلایا "کوئی ہے جو اس بچے کو ہیرڈ کی نظروں سے دور کسی دیش میں لے جائے۔" لیکن نہ میری کڑیاں ٹوٹتی ہیں اور نہ جیل کا دروازہ کھلتا ہے۔ پہریدار جاگ رہے ہیں اور جمنا کی لہریں اونچی ہوتی چلی جا رہی ہیں۔ اور میں سیل پر پٹکے جانے کے لئے کنس کا انتظار کر رہا ہوں۔

اور اس اندھیرے میں جہاں نہ ہوا ہے نہ روشنی، نہ راستہ نہ منزل۔ میں نے ایک بچے کو جنم دیا ہے۔ جس کے کندھے پر صلیب ہے۔ میں نے جنم سے ہی اپنے کندھے پر صلیب لئے بستی بستی، نگر نگر گھوم رہا ہوں تاکہ جب بھی کسی کو ضرورت پڑے وہ اسے زمین میں گاڑ دے۔ اور مجھے سولی پر چڑھا دے۔ اب میری کوئی آنند نہیں۔ مجھے سولی پر چڑھنے کا غم نہیں۔ اے خدا مجھے اتنی قوت عطا کر کہ میں یہ صلیب اٹھائے اس منزل تک لے جا سکوں جہاں مجھے اس سے ہم کنار ہونا ہے۔"

میں صلیب لئے لئے چل رہا ہوں۔ میرے پیچھے پیچھے مردہ روحیں بھوت پریت جیک بوٹوں میں سنگین لگی بندوقیں اور اجنبی چہرے گاتے بجاتے شور مچاتے چلے آرہے ہیں۔ اس بے پناہ ہجوم میں میں تنہا چل رہا ہوں۔ آوازیں آرہی ہیں۔ اسے زمین میں گاڑ دو۔ اسے سولی پر لٹکا دو۔ اور سولی پر تتلی کے پر، مور کے بے رنگ پنکھ، سسکتی بلبل، ادھ جلی کتاب، رات کے آنسو، ٹوٹے پھول، ہراساں نظروں سے مجھے تک رہے ہیں۔ آہنی کیلیں میرے ہاتھوں اور میرے پاؤں پر گاڑی جانے لگیں۔ اچانک زور کا دھماکہ ہوا۔ جیسے قیامت کا شور ہو۔ چاروں طرف دھواں ہی دھواں پھیل گیا۔ جب دھواں کچھ کم ہوا تو میں نے دیکھا کہ مردہ روحیں بھوت پریت جیک بوٹ، سنگین لگی بندوقیں، اجنبی چہرے سب شکستہ پڑے ہیں۔ مُردوں کی اس بستی میں صرف میں زندہ ہوں۔ کیونکہ میں ہی سولی پر لٹکا ہوا ہوں۔ میرے جسم سے خون بہہ رہا ہے۔ میں زور سے چیخا۔ جب آنکھ کھلی تو سارا جسم شدّت خوف سے کانپ رہا تھا۔ میں پسینے سے تربتر تھا۔ سانس زور زور سے چل رہا تھا۔ جیسے رات بھر دوزخ کی آگ میں جلتا رہا ہوں۔ کمرے میں اندھیرا تھا۔ باہر ہلکی ہلکی سپیدی نمودار ہو رہی تھی۔ میز پر تازہ پھول گلاس میں پڑے ہوئے تھے۔ اور سامنے کارنس پر وینس کا بت بدستور موجود تھا۔ پڑوسی کے مکان سے آواز آرہی تھی۔

ہے ری میں تو پریم دیوانی ۔ میرا درد نہ جانے کوئی ۔

"رات بھر جلتے ہوئے اسٹوو پر ہاتھ پڑا رہا۔ کچھ معلوم ہی نہیں ہوا" میرا نے کہا۔

"جلتے ہوئے اسٹوو پر ــــ"

میں نے اپنا ہاتھ دیکھا۔ اس پر گہرا سیاہ نشان تھا۔ لیکن میری حیرانی کی حد نہ رہی جب میں نے دیکھا کہ یہ ہاتھ وہی ہیں جنہیں رات کے اندھیرے میں وینس کے بت نے چوما تھا جنھوں نے مجھے ملبے کے ڈھیر سے نکالا تھا۔ میں نے

بے اختیار اپنے ہاتھوں کو چوم لیا۔

پٹروس سے بدستور آواز آ رہی تھی۔

"سولی اوپر سیج ہماری، کیسے سونا ہوئے

ہے ری میں تو پریم دوانی، میرا درد نہ جانے کوئے"

کالی بلّی

دروازہ آہستہ سے کھلتا ہے۔ اور روشنی کی ایک لمبی مستطیل پانی سی پھیلتی میری چارپائی کے نیچے داخل ہو کر دیوار سے جا ٹکراتی ہے اور پھر دبے پاؤں وہ کالی بلی روشنی کی مستطیل پر چلتی ہوئی چارپائی کے نیچے دیوار کے ساتھ جہاں روشنی کی مستطیل ٹکراتی ہے دبک کر آ بیٹھتی ہے۔

اور جب تک اسٹوو پر پانی کے کھولنے کی آواز نہیں آتی اور میں کتاب سرہانے پٹک کر اٹھ نہیں بیٹھتا۔ مجھے ہمیشہ یہی احساس رہتا ہے کہ ابھی کالی بلی چارپائی کے نیچے سے باہر نکل کر میرے سامنے میز پر لپک کر آ بیٹھے گی اور پوچھے گی۔

"وہ آدمی کہاں گیا؟"

میں پوچھوں گا "کون آدمی؟"

اور اس کا جواب ہوگا۔

"وہی آدمی"

اور پھر وہ پاگلوں کی طرح بین کرتی روشنی کی مستطیل پر دوڑتی دروازے سے باہر نکل جائے گی۔ اور اس کے پیچھے پیچھے روشنی کی مستطیل سمٹ کر دروازے کو بند کرتی غائب ہو جائے گی۔ اور کمرے میں مکمل اندھیرا، مکمل سناٹا چھا جائے گا۔ اور اس اندھیرے میں اگر کالی بلی واپس بھی لوٹ آئے تو مجھے اس کا احساس نہیں ہوگا۔

لیکن وہ آدمی واقعی کہاں گیا؟

کتنے دن شاید کتنے برس بیت گئے اس سے میری ملاقات نہیں ہوئی۔ مجھے معلوم نہیں وہ کون ہے؟ کہاں سے آیا ہے؟ کیا کرتا ہے؟ اور جب ایک دن میں نے اس سے پوچھ ہی لیا کہ تم کون ہو؟ تمہارا نام کیا ہے؟ تم کیا کرتے ہو؟ تو اس نے جواب دیا تھا۔

"ایک آدمی۔ کوئی بھی ایک آدمی۔ اور میرا پیشہ ۔ زندہ رہنے کے لئے آدمی کو سب کچھ بننا پڑتا ہے۔ سوائے خود کے۔"

ویسے اس نے مجھے بتایا تھا کہ وہ سیلزمین ہے اور پھر جب وہ دوبارہ ملا تو اس نے کہا تھا وہ ایڈمین سے ہے۔

"سیلزمین یا ایڈمین کی اپنی کوئی حیثیت نہیں ہوتی۔ وہ ہمیشہ دوسروں کی بنائی ہوئی چیزیں بیچتا ہے۔ دوسروں کے بنائے ہوئے خیال کو مشتہر کرتا ہے۔ شاید وہ کچھ بھی نہیں بیچتا سوائے مال کے تصور کے۔ وہ آدمی کو نہیں آدمی کے عکس کو مشتہر کرتا ہے۔" اس نے کہا۔

"لیکن تمہیں کیسے معلوم ہوا کہ میں تمہاری دوائیں خریدوں گا؟" میں نے پوچھا۔

"ایک روز میں ادھر سے گزرا۔ تمہارے گھر کے باہر کوڑے دان میں دواؤں کی خالی شیشیاں پڑی تھیں۔ میں نے وہ شیشیاں اٹھالیں۔ کاغذ کے کچھ ٹکڑے تھے۔ سگریٹ کے ٹوٹے تھے۔ پرانی تصویریں تھیں۔ اخبار کی کترنیں تھیں۔ میں نے سب کچھ اپنے بیگ میں ڈال لیا اور پھر گھر آ کر میں نے ان سب چیزوں کا بغور مطالعہ کیا اور مجھے معلوم ہوا کہ تمہیں کوئی روگ نہیں۔ تمہیں دوا نہیں دوا کا سہارا چاہیئے اور مجھے معلوم ہوا کہ تم ہر آدمی سے ہر چیز سے ٹوٹ چکے ہو بلکل اور پر اور میں ہمیشہ اسی آدمی کی تلاش میں رہتا ہوں جو بالکل ٹوٹ چکا ہو۔ کیونکہ تم اسے ایک نئی شکل دے سکتے ہو۔ نیا چہرہ، نئی روح، نیا دماغ۔ تاکہ وہ دوسرے آدمیوں سے مختلف ہو سکے۔"

"ہر آدمی دوسرے آدمی سے مختلف ہوتا ہے۔" میں نے کہا۔

"لیکن وہ یہ نہیں جانتا شاید وہ یہ جاننے سے ڈرتا ہے" وہ بولا۔ "کیونکہ الگ ہونا خطرناک ہے۔ بڑا پریشان کن ہے۔ پھر تم ہر آدمی سے الگ ہو جاؤ گے۔ اسی لئے لوگ سنیما گھروں میں، ریستورانوں میں کھیل کے میدانوں میں، شادی بیاہ کی پارٹیوں میں جلسے جلوسوں میں اسکولوں میں اور سڑکوں پر بھیڑ میں اکٹھا ہوتے ہیں تاکہ وہ سب ایک ہو جائیں۔ تاکہ وہ ایک دوسرے سے جڑ جائیں۔ الگ ہو کر زندہ رہنا بڑا مہلک ہے۔ بدھ ایک تھا۔ کرائسٹ ایک تھا۔ پھر ان کے پیچھے بھیڑ اکٹھی ہو گئی۔ لیکن پھر بدھ کوئی نہیں ہوا۔ کوئی کرائسٹ نہیں ہوا۔"

وہ خاموش ہو گیا۔ کمرے میں روشنی جلنے بجھنے لگی۔ پنکھا تیزی سے ایک ہی دائرے میں ایک ہی دھری پر گھوم رہا تھا۔ بات کا سلسلہ ٹوٹ گیا۔

"سگریٹ پیو گے؟" میں نے پوچھا۔

"نہیں" اس نے کہا۔

"تم سگریٹ نہیں پیتے۔ سیلز مین ہو کر بھی۔ یہ سگریٹ کے دھوئیں کے ساتھ ہی تو رشتے بنتے بگڑتے ہیں۔" اس نے کہا "اور پھر سوائے راکھ کے کچھ باقی نہیں رہتا۔ کچھ بھی نہیں۔ نہ سگریٹ نہ سگریٹ کا دھواں" اس نے کہا۔

"کیا کینسر سے ڈرتے ہو؟"

"نہیں کینسر سے نہیں ریڈیو تھراپی سے"۔ وہ بولا۔

"تو تم مرض سے نہیں مرض کے علاج سے ڈرتے ہو۔" میں نے کہا۔

"ہر آدمی کسی نہ کسی چیز سے ڈرتا ہے۔ بجلی کے دھکے سے، حادثے سے، پیسے سے، ہائڈروجن بم اور ہائڈروفوبیا سے، ہیروشیما سے اور موت سے، بلی سے عورت سے، آدمی سے، کیا تم کسی چیز سے نہیں ڈرتے؟" اس نے اچانک پوچھا۔

"اور تم؟" میں نے سوال کیا۔

"میں روشنی سے ڈرتا ہوں" وہ بولا۔

"روشنی سے؟"

اس لئے کہ روشنی میں مجھے کالی بلی نظر آ جاتی ہے۔ اور مجھے کالی بلی سے بڑا ڈر لگتا ہے

مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ کسی دن کار کی تیز روشنی میں اندھی ہو کر کالی بلّی اس کے نیچے آجائے گی اور وہ حادثے کا شکار ہو کر دم توڑ دے گی۔ اور پھر وہ میری روح کے گرد منڈلاتی رہے گی۔ جب تک کہ۔" وہ ایکدم چپ ہو گیا۔

"جب تک کہ ۔۔؟" میں نے پوچھا۔

"جب تک کہ میری روح اس مردہ بلّی میں داخل نہیں ہو جاتی اور میں انسان سے بلّی نہیں بن جاتا۔" جانتے ہو بلّی نو بار جنم لیتی ہے۔" وہ بولا۔

"اور مرنے کے بعد انسان چوراسی لاکھ بار۔" میں نے کہا۔

"مرنے کے بعد نہیں صرف مرنے سے پہلے" اس نے کہا۔

میرے آنگن میں کپڑے سکھاتی عورت کے گنگنانے کی آواز آتی ہے۔ رم جھم رم جھم برکھا ہے۔ رم جھم رم جھم برکھا ہے۔

گرمی کی جھلستی ہوئی دھوپ ہو یا سردیوں برفانی راتیں۔ وہ ہمیشہ یہی گنگناتی رہتی ہے۔ شاید وہ ازل کی پیاسی ہے۔ اور برکھا کے انتظار میں نہ جانے کب سے جی رہی ہے۔

اس عورت کے گنگنانے کی آواز جب بھی آتی ہے وہ خاموش ہو جاتا ہے۔ پھر وہ کچھ نہیں بولتا۔ آنگن اور میرے کمرے کے بیچ ایک دروازہ ہے جسے نہ اس نے بند کیا ہے اور نہ میں نے لیکن نہ جانے پھر وہ بند کیوں ہے۔ اور اس طرح بند پڑے پڑے وہ دروازہ دروازہ نہیں رہا۔ دیوار بن گیا ہے۔

"تم اس دروازے کو کھول کیوں نہیں دیتے؟" اس نے ایک بار کہا تھا۔

"نہ جانے وہ عورت کون ہے۔ شادی شدہ ہے یا کنواری" میں نے کہا۔

"تم عورت سے ڈرتے ہو؟" اس نے پوچھا۔

"نہیں تو"

"شاید تم عورتِ محض سے ڈرتے ہو۔ اگر تمہیں معلوم ہو جائے کہ وہ کسی کی بیوی ہے یا بیٹی یا ۔۔۔"

"تم کیا کہنا چاہتے ہو؟" میں نے اسے ٹوکا۔

"یہ کہ اس صورت میں تم عورت کے بارے میں اپنا طرزِ عمل فوراً طے کر لیتے۔ اگر تم جانتے کہ وہ عورت کون ہے؟ کیونکہ وہ عورتِ محض ہے۔ اس لئے تم ڈرتے ہو۔ جس دن تم عورت کو عورت محض سمجھ لوگے، جس طرح کہ تم مرد ہو۔ سیلز مین یا ایڈمین نہیں تو یہ دروازہ خود بخود کھل جائے گا۔" اس نے کہا۔

"تم مجھے دورِ وحشت کی طرف لے جانا چاہتے ہو؟" میں نے کہا۔

"نہیں میں تمہیں تہذیب کی اس منزل پہ لیجانا چاہتا ہوں جہاں تم انسان کو انسانِ محض کی حیثیت سے پہچان سکو۔" وہ بولا۔

"کیا تم انسانِ محض ہو؟" میں نے پوچھا۔

"نہیں جس روز میں انسانِ محض ہو جاؤں گا اس دن تمہاری تہذیب مٹ جائے گی۔ یہ بیچ کا دروازہ جو نہ کھلا ہے نہ بند بس ایک دھبے کی طرح تمہاری روح کے اندر دھنستا ہوا ایک دم سے کھل جائے گا۔ ہمیشہ کے لئے اور روشنی کا ایک سیلاب امڈ کر تمہارے کمرے کو چکا چوند کر دیگا۔ اس نے کہا۔

اور اگر دروازہ کھلا تو؟" میں نے اپنا شک ظاہر کیا۔

"تو انسانِ محض مٹ جائے گا۔" اس نے بڑے اطمینان سے کہا۔

"اور موت چاہے بند دروازے کے اندر ہو یا کینسر سے، موت ہے"۔ وہ بولا۔

اس نے اپنا بیگ کھولا اور اس میں سے ڈھیر ساری شیشیاں، ڈبیاں، اور انجکشن کے سیمپلس نکالے۔

"یہ سب دوائیں انسان کو موت سے بچانے کے لئے ہیں۔ ہزاروں برسوں کی محنت کے بعد انسان نے انہیں تیار کیا ہے۔ اور پھر ایسی ہی لیبارٹریوں میں ہزاروں انسان دن رات کام کرتے ہیں۔ موت کی دوائیں اور موت کے مہلک جرثومے بنانے کے لئے۔ اور یہ دونوں طرح کی دوائیں میں بیچتا ہوں۔ کیونکہ میں سیلز مین ہوں، ایڈمین ہوں، آرگنائزیشن مین ہوں"۔

"یعنی تم انسان محض نہیں"۔ میں نے کہا۔

"ہاں میں انسانِ محض نہیں"

وہ ایکدم اٹھ کھڑا ہوا۔ اس نے ساری دوائیں فرش پر پھینک دیں۔ فرش پر شیشے کے ٹکڑے۔ کارک، ہرے، نیلے، پیلے رنگ اور گولیاں بکھر گئیں۔ وہ ایک لمحہ انہیں دہشت سے دیکھتا رہا۔ اس کا سارا جسم نیلا پڑتے پڑتے سیاہ ہو گیا۔ صرف اس کی دو آنکھیں اندھیرے میں چمک رہی تھیں۔

آنگن میں کپڑے سکھاتی عورت کے گنگنانے کی آواز آ رہی تھی۔ رم جھم رم جھم برکھا برسے، رم جھم رم جھم برکھا برسے۔

وہ زور سے چلاّیا۔

"بریک پلیز۔ بریک۔ کالی بلّی۔"

میں اندر کی طرف لپکا۔ اس نے زور سے دروازے کو جھٹکا دیا۔ دروازہ دھماکے سے کھلا اور وہ باہر نکل گیا۔

آنگن میں کپڑے سکھاتی عورت کے گنگنانے کی آواز آ رہی تھی۔

کمرے میں صرف ایک کالی بلّی میری چارپائی کے نیچے دیوار کے ساتھ جہاں روشنی کی مستطیل ٹکراتی ہے۔ دبکی ہوئی بیٹھی تھی۔

مردہ گھر

مردہ گھر میں میری لاش پڑی ہے۔
مال گاڑی سے اتاری گئی بند بوریوں سی پھولی، لیبل لگی تین چار لاشیں اور بھی مردہ گھر میں پڑی ہیں۔
جب میری لاش مردہ گھر میں لائی گئی تو سورج دھیرے دھیرے دور مٹیالی پہاڑیوں کی اوٹ میں پھسل رہا تھا اور پہاڑی پر ٹکے بادلوں میں آگ کے گولے کی لال کرنیں شعلہ سی بھڑک رہی تھیں۔ افق سے ٹوٹی ہوئی لالی بند کھڑکی کے شیشوں میں جلتے لوہے سی پگھلنے لگی۔ دھندلاہٹ مٹی کے غبار میں اندھیرے کے ذرے تیر رہے تھے۔ اور میں پہچان نہ سکا کہ مجھے مردہ گھر میں کون لایا ہے۔ سائے دھیرے دھیرے روشنی کو نگلنے لگے۔ اور پھر روشنی اور سائے کا فرق مٹ گیا۔
کمرے میں اندھیرا کالے ناگ کی طرح رینگ رہا تھا۔ سرخی سیاہ ہو چکی تھی۔ آگ کا گولا اندھیرے کے غار میں ڈوب چکا تھا۔ اندھیرا سرکتے سرکتے بہت قریب آ کر میرے سرہانے کھڑا ہو گیا۔ لاشوں کے سفید کفن بھی سیاہ پڑ گئے۔ مردہ گھر، برگد کا بوڑھا پیڑ، بجلی کا کھمبا، اسپتال کی وسیع عمارت، سامنے نرسوں کے کوارٹر، ٹرک، گھاس، پھول، کانٹے دار تاریں، سائیکل اسٹینڈ، مریضوں کے کمرے، حد بندی کی دیوار ——— سب پر موت کی کالی چھایا پھر گئی۔
مریض وارڈوں میں داخل ہو چکے تھے۔ ان کے ملنے والے گھر لوٹ گئے۔ ایمبولنس وین اور مردہ گھر کی گاڑی یتیموں سی کھڑی تھیں۔ کبھی کبھی کوئی کراہ لیتا تھا۔ لوٹتا ہوا

پرندہ پر پھڑپھڑا لیتا تھا۔ ہارن بجانا منع تھا۔ لیکن دور سے اس سناٹے میں سنائی دے جاتا تھا۔

قریب کسی کے قدموں کی آواز سنائی پڑی۔ شاید کوئی لاش اور لائی جا رہی تھی۔ لیکن آواز آگے بڑھ گئی اور کتا آواز کے پیچھے دیر تک بھونکتا رہا۔ درختوں کے پتے گر رہے تھے۔ سوکھے کھڑکھڑاتے پتے۔ اور تیز ہوا ٹہنیوں میں گونی کی آواز کی طرح گونج رہی تھی۔

اور پھر آوازیں دھیرے دھیرے سناٹے میں کھو گئیں۔ ایسے میں کوئی پتّا بھی گرتا تو سہم جاتا۔

مردہ گھر کے دروازے کی درز سے روشنی کی ایک لکیر نہ جانے کہاں سے آجاتی اور جب وہ بھی غائب ہو جاتی تو اندھیرا اور بھی گہرا ہو جاتا۔ میں مر چکا ہوں پھر بھی نہ جانے کب سے ایک بے نام سا خوف میری روح میں گڑا جا رہا ہے۔ برگد کے پیڑ پر الٹی لٹکی چمگادڑوں کو دیکھ کر ایک بار لاشیں بھی کانپ جاتی ہیں۔ کوئی چمگادڑ جب مردہ گھر کی ایک دیوار سے دوسری دیوار کی طرف اڑتی ٹکراتی ہے تو کمرے میں اندھیرے کی بھٹکن اور بھی تیز اور گہری ہو جاتی ہے۔

میری موت کیسے ہو گئی؟ ابھی کچھ لمحے پہلے میں زندہ تھا۔ میرا خیال ہے کہ میں اب بھی زندہ ہوں کیونکہ میری لاش اب بھی سردی میں ٹھٹھر رہی ہے۔ اور مجھے اب بھی کچھ کچھ یاد آتا ہے، کچھ کچھ، مدھم مدھم سا، موہوم سا کچھ۔

مجھے کوئی روگ نہیں ہوا۔ پیٹ، ہیٹھ پر کسی نے چھرا نہیں گھونپا۔ دل دماغ میں کوئی گولی نہیں لگی، نہ حرکتِ قلب بند ہوئی، نہ دماغ کی کوئی نالی پھٹی، نہ جسم جلا نہ دل سے درد اٹھا، تو پھر میں اچانک مر کیسے گیا؟

ساتھ والی لاش نے شاید کروٹ بدلی۔ اب اس کے مرنے کا ایک سبب ہے، ایک سلسلہ ہے، شاید انسان کی مشیت کا راز اسی میں مضمر ہے۔

پہلے ہلکے ہلکے کھانسی ہوئی، پھر متواتر کھانسی آنے لگی، بخار بھی ہونے لگا۔

جسم دبلا نحیف، چہرہ پیلا زرد اور دل اداس ہو گیا۔ پھر کھانسی کے ساتھ خون بھی آنے لگا۔ اور جب خون آنے لگا تو وہ گھبرا گیا کہ اب وہ کسی دن کسی بھی لمحے مر سکتا ہے۔ اسے اندر ہی اندر کوئی کھا رہا ہے، کوئی گھن لگ گیا ہے۔ ویسے اسے کوئی بھی روگ ہو سکتا تھا۔ روگ کے انتخاب میں وہ آزاد نہیں تھا۔ ساتھ والے بستر پر پڑے پڑے اس نے ایک دن بتایا تھا کہ وہ برسوں سے اس روگ کو پال رہا ہے۔ بڑے پیار سے نرمی، بڑی رفاقت سے ایسے ہی جیسے وہ کسی نظم کی تخلیق کر رہا ہے، بے اختیار، نامعلوم، بے ارادہ، اور تب اسے معلوم ہوا کہ وہ شعر کے ساتھ ساتھ دق کے جراثیم پال رہا ہے۔ جب لکھتے لکھتے اسے زوروں کی کھانسی ہوئی، پھیپھڑوں میں درد ہوا اور خون کا ایک کالا دھبہ کورے کاغذ پر جا پڑا — ایک شعر کی تخلیق۔

— اندھیرے کے خلا میں بھٹکتی ہوئی، آسیب زدہ نجس سائے سی زندگی۔

"شعر اور دق کے جراثیم شاید ایک ساتھ ہی جنم لیتے ہیں، ایک ساتھ ہی پلتے ہیں" اس نے کہا۔

میں نے اس کی طرف دیکھا۔ کتنا رومانٹک تصور تھا اس کا! جیسے تپ دق ہی شعر کا سرچشمہ ہے۔

ساتھ والے وارڈ میں کوئی یکبارگی کراہ کے ٹوٹ گیا۔

اس نے مجھے دیومالا کا ایک قصہ سنایا۔

"فیلو اسٹیٹس بڑا طاقتور تھا لیکن اس کے پاؤں میں ایک ایسا زخم تھا جس سے بڑی نفرت انگیز بدبو آتی تھی۔ اس کے ساتھی اس کے رستے ہوئے زخم اور بدبو کو برداشت نہ کر سکتے تھے۔ اس کے پاس ایک کمان تھی جو دشمنوں کو فنا کر سکتی تھی۔ اور جس کا نشانہ اچوک تھا۔ مگر اس کے زخم کا کوئی مداوا نہیں تھا۔ بدبودار رستے ہوئے زخم کے باعث اس کے ساتھی اسے اکیلا چھوڑ کر چلے گئے، لیکن اپنے دشمنوں پر فتح پانے کے لئے انہیں اس کی ضرورت پڑی کیوں کہ صرف اس کے پاس ہی ناقابل تسخیر

حربہ تھا۔'' ''لیکن اگر کسی کا زخم زیادہ گہرا ہے تو کیا وہ اسی باعث بڑا فنکار ہے یا جس کی صلاحیت زیادہ ہے اس کا زخم بھی بڑا ہے؟ میں نے پوچھا۔

وہ تھوڑی دیر خاموش رہا۔ اور پھر بولا۔

''تم ٹھیک کہتے ہو۔ سوال زخم کا نہیں بلکہ یہ ہے کہ کون زخم خوردہ ہے ایک عام کند ذہن یا ایک مہاکوی''۔

اس نے کروٹ بدلی۔ وہ زور زور سے کھانسنے لگا۔ اور خون کی ایک دھار اس کے پھیپھڑوں سے پھوٹ پڑی۔ اس نے نیم بند آنکھوں سے کمرے میں پڑے سب مریضوں کو دیکھا اور پھر سو گیا۔ نرس دیر سے آئی تھی۔ اور وہ جا چکا تھا۔

آج اس نے اپنی پریم کہانی سنائی تھی۔

چاندنی میں لپٹے ہوئے چیڑ کے درختوں سے ہوا گزرتے ہوئے رو رہی تھی۔ بے حسی مجھ پر طاری ہونے لگی۔ بس اتنا یاد ہے کہ سفید کپڑوں والی کوئی عورت ڈرائی میں دروازے کے سامنے سے گزر گئی۔

وہ نہ تو شاعر ہے اور نہ ہی اختلاج قلب کی مریض۔ پھر اس نے خودکشی کیوں کی؟ دلوگ کہتے ہیں کہ اس پر کسی بھوت کا سایہ ہے۔ جب بھی وہ کمرہ اور کھڑکیاں بند کرتی ہے۔ اور پردے گراتی ہے تو اسے کوئی خوف جکڑ لیتا ہے۔ چاروں طرف خاموشی ہوتی ہے مکمل سناٹا، لیکن وہ اس دیوار سے اس دیوار کی طرف بھاگتی ہے۔

''تم کہاں ہو؟ سامنے کیوں نہیں آتے؟ لو میں دروازے کھول دیتی ہوں۔ ایشور کے لئے باہر نکل جاؤ'' وہ چلاتی اور پھر دروازے اور کھڑکیاں کھول دیتی، پردے ہٹا کر اور ایک لمبی سانس لیتی اور صوفے پر مفلوج سی گر پڑتی۔ اف۔ اور پھر جب وہ دروازے اور کھڑکیاں بند کرتی اور پردے گرا دیتی، کمرے میں مکمل اندھیرا اور خاموشی ہو جاتی تو پھر ڈراما شروع ہو جاتا۔ وہ چلاتی: میں پاگل ہو جاؤں گی''۔

کیا وہ پاگل نہیں تھی؟ جسے بند، اندھیرے کمرے میں کسی بھٹکتے ہوئے، آشیاں سے بچھڑے پرندے کے پر پھڑپھڑانے کی آوازیں آتی رہیں۔ جہاں وہ جاتی ہے یہ پرندہ اس

کے ساتھ ساتھ جاتا ہے۔ وہ اس سے بھاگتی ہے، اس دیوار سے اس دیوار تک۔ ایک ریستوران سے دوسری تفریح گاہ تک پہاڑی مقاموں پر، سمندر کے کنارے، سنسان ویران جگہوں اور بھرے پڑے بازاروں میں، لوگوں کے ہجوم میں، اکیلے۔ یہ پرندہ اس کے شانے پر بیٹھا رہتا ہے۔ نہ اڑتا ہے نہ مرتا ہے۔

جب کیز یولٹی روم میں اسے لے جا رہے تھے تو میں نے اسے دیکھا تھا: تازہ کھلے پیلے پھول کی طرح خوبصورت، کھوئی کھوئی سی، آنکھیں حیرت بھری، بکھرے ہوئے بال جنوں خیز، خاموش سنجیدہ ۔۔ اور جب اس نے ڈھیر ساری نیند کی گولیاں کھالیں تو اس کی روح کو کچھ سکون ملا۔ محو حیرت ہوں کہ دنیا کیا سے کیا ہو جائے گی شاید اس کی نیند غائب ہو چکی تھی۔ ایک اٹوٹ نیند، عالم جذب کیلئے، جس میں محض خواب ہے حقیقت نہیں۔ شاید یہ موت انہیں خوابوں کے باعث تھی۔ مردہ گھر میں اس کی روح پر بہت سی گھوم رہی تھی۔ ایک بھٹکے ہوئے آشیاں سے بچھڑے پرندے کی طرح۔ ایک دیوار سے دوسری دیوار تک۔

"آج شام کو ملنا، سات بجے، ٹھیک سات بجے، پارک میں۔"

"او۔ کے۔" نرس نے ڈاکٹر کو جواب دیا اور مسکرادی اور پھر مریض کو انجکشن لگانے میں لگ گئی۔

"مجھے سمجھ نہیں آتا کہ لوگ ایک چھلاوے سے اتنا کیوں ڈرتے ہیں؟ اپنی زندگی ایک واہمے کے لئے کس طرح برباد کر دیتے ہیں!" نرس کہہ رہی تھی۔

"پوور سول۔ کسی سے عشق وشق ہو گیا ہوگا۔" وہ بولی۔

میں نے کروٹ بدلی۔ کیا عشق کے بغیر انسان کی نجات نہیں؟

"سوال عشق یا خودکشی کا نہیں، سوال اس واہمے کا ہے جس کیلئے لوگ زندگی لٹا دیتے ہیں۔" شاعر نے کہا تھا۔

"کیا حقیقت ہے اور کیا واہمہ؟ کیا صداقت ہے اور کیا شاعری؟ ان سوالوں کا جواب میں کیسے دے سکتا ہوں شاعر۔ نہ میں نے کبھی شعر کی تخلیق کی ہے نہ ہی کسی

سے پیار۔ میں تو ایک عام آدمی ہوں۔"

نہ جانے اس نیم شعوری کی حالت میں مجھے بچپن کی باتیں کیوں یاد آرہی تھیں!
میں چھت پر پتنگ اڑا رہا تھا۔ پتنگ اوپر ہی اوپر اڑتا جا رہا تھا، آکاش کے
وسیع کھلے پن میں، جیسے وہ کسی ڈور سے نہیں بندھا محض ہوا کے دوش پہ اوپر ہی اوپر
اڑ رہا ہے۔ ایک دوسرا پتنگ اس کی طرف بڑھنے لگا۔ دھیرے دھیرے وہ ایک دوسرے
کے قریب آتے گئے۔ قریب آتے آتے ایک دوسرے سے الجھ گئے۔ ڈور ختم ہو رہی تھی۔
ڈر تھا کہ میرا پتنگ کٹ نہ جائے۔ میں نے ایک جھٹکا دیا۔ دوسرے کا پتنگ کٹ گیا۔ میں خوشی
سے اچھل پڑا۔ کٹا پتنگ بہت دیر تک ہوا میں تیرتا رہا اور ہم بہت دور تک اس کے پیچھے
بھاگتے رہے۔ پتنگ بیری کے ایک درخت پر کانٹوں میں الجھ گیا۔ جھٹ میں درخت پر چڑھ
گیا۔ کانٹوں میں اُلجھتے میں نے پتنگ جھپٹ لیا۔ میرا جسم زخمی ہو چکا تھا، میرے کپڑے پھٹ
گئے تھے لیکن جیت کے نشے میں میں نے سب کچھ برداشت کر لیا۔ جب میں نیچے اترا تو ایک
بھدا سا بڑا لڑکا کھڑا تھا۔ وہ مجھے گھور رہا تھا۔ "یہ پتنگ میرا ہے!" اس نے کہا۔

میں نے ڈرے ہوئے لہجے میں اس سے کہا: "یہ میں نے جیتا ہے"۔

"دیتا ہے یا دوں ایک ۔۔" اور اس نے مجھے ایک گندی گالی دی تھی! میں
نے دریوزہ گر نظر سے اس کی طرف دیکھا لیکن اس کے اکڑتے ہوئے ہاتھ دیکھ کر میں کانپ گیا
میں نے پتنگ اسے دے دیا۔ مجھے ایسا محسوس ہوا کہ میں ایک چوہا ہوں۔ جو بلّی کے ڈر سے
اپنے بل میں گھس گیا ہے۔

اور پھر میں نے پتنگ اڑانا چھوڑ دیا۔ ہر کھیل: گیند بلا، ہاکی، فٹ بال ۔۔
سب کچھ چھوڑ دیا۔ ہر جگہ تو بڑا لڑکا ہوتا تھا۔ میں اکیلا دور نکل جاتا۔ ریل کی پٹریوں کے ساتھ
ساتھ چلتا رہتا اور پلیا پر جا بیٹھتا۔ رنگ برنگی تتلیاں پکڑنے کی کوشش کرتا۔ میں گھنٹوں
اسی طرح بھوکا پیاسا دنیا سے بے خبر کالی، پیلی، نیلی، قوس قزحی تتلیوں کے پیچھے بھاگتا
رہتا یا بارش کے دنوں میں کاغذ کی ناؤ چلاتا رہتا جب تک کہ ان میں پانی نہ بھر جاتا اور
وہ ڈوب نہ جاتیں۔ شاید بے کار گھومتے ہوئے ان لمحات میں میں نے محسوس کیا کہ میں

شاعر ہوں۔

میں نے وہ شہر چھوڑ دیا۔ کیوں؟ روزگار کی تلاش میں یا کسی دوسرے کے خوف سے؟ لیکن یہ فیصلہ میں نے اس دن کیا تھا جب وہ ٹراٹر کا اپنی کار میں اپنی نئی بیاہی بیوی کو لئے فراٹے سے میرے پاس سے گزر گیا۔ کار کی دھول کے غبار میں میں لپٹ گیا۔ اس کی بیوی سے مجھے عشق نہیں تھا لیکن وہ بچپن میں میرے ساتھ پانی میں ناؤ ضرور چلایا کرتی تھی۔

"کوی تم شاعری خوب کرتے ہو کیا اس لڑکی کو آزاد نہیں کرا سکتے؟ میرے دل نے شاعر سے پوچھا۔

"کس لڑکی کو؟"۔

لیکن وہ تو مر چکا تھا۔ اس کی سب بحث ختم ہو چکی تھی۔ شاعر کا فرض کیا ہے؟ اس کا وشواس کیا ہے؟ میرے دل میں شک کے کالے بادل منڈلانے لگے۔

میرا وشواس کیوں ڈول گیا؟ میرا غصہ، میری تشدد کی خواہش اس وقت غائب ہو گئی جب آدھی رات کو جیل میں دو ہاتھ کسی دوسرے کے سرہانے کے نیچے ڈبل روٹی چرا رہے تھے۔

کمرے میں کار کے پہیوں کے گھسٹ کر زور سے رکنے کی آواز آئی۔ ایکدم بریک لگی اور ایک چیخ فضا میں گونج اٹھی۔ کار کی روشنی کا آئینہ اندھیرے میں گھوم گیا اور سفید کپڑوں میں لپٹی لاشیں جگمگا اٹھیں۔ کار ایکدم اسٹارٹ ہوئی اور فراٹے بھرتی ہوئی نکل گئی۔ کمرے کے اندھیرے میں بڑی دیر تک چیخ گونجتی رہی۔ چاروں طرف سے چیخیں گونجنے لگیں۔ دور رات کے اندھیرے میں کوئی سسک سسک کر دم توڑ رہا تھا۔ پہلے اس سے زنا بالجبر کیا گیا اور پھر اسے ننگا کرکے سردیوں کی ٹھٹھرتی رات کو بجلی کے کھمبے کے ساتھ لٹکا دیا گیا۔ اور اس کے سینے میں گولی داغ دی گئی اسکے سر پر بجلی کا بلب جل رہا تھا۔ اسکے برہنہ جسم کا ہر زخم روشن تھا۔

ایسی ہی ایک چیخ میں نے پھر سنی۔ رات کے اندھیرے میں گاڑی دھیرے دھیرے

رینگ رہی ہے۔ ایکدم نعروں کا شور بلند ہوا اور گاڑی رک گئی۔ نیزے، بھالے، بلّم تلوار لئے لوگ گاڑی میں گھس آئے جسم کٹنے لگے۔ عورتیں مرد، بچے لہو میں ڈوبے ہوئے تھے۔ کسی نے ایک بچے کو چاند کی گیند کی طرح ہوا میں اچھالا اور پھر نیچے بھالا رکھ دیا۔

رات کے سناٹے میں ایک چیخ گونجی اور پھر ایک قہقہہ بلند ہوا۔

صدیاں بیت چکی ہیں لیکن وہ تنہا ابھی تک سولی پر کیوں لٹکا ہوا ہے؟

رات آدھی سے زیادہ بیت چکی ہے۔ باہر قدموں کی چاپ سنائی پڑ رہی تھی۔ برآمدے کے پتھروں پر جیک بوٹوں کی کھٹا کھٹ۔ شور اور دھواں اور پھر ایک کال کوٹھری سے ایک نوجوان کو کھینچ کر نکالا گیا۔ رات کے خاموش اندھیرے میں چوروں کی طرح اسے شہر سے باہر لیجایا گیا۔ اور ندی کے کنارے اس کے ٹکڑے ٹکڑے کر کے پانی میں بہا دیا گیا۔ جیک بوٹوں کی آواز پتھروں پر بڑی دیر تک گونجتی رہی۔

دن ــــ دنا ــــ دن ــــ گولیاں چل رہی تھیں۔ عورتیں، مرد، بچے، سب نہتے۔ بھگدڑ مچی ہوئی تھی۔ چار دیواری کے گھیرے میں شام کی تاریکی میں انہیں گولی سے اڑایا جا رہا ہے۔ سینوں پر گولیوں کے داغ لئے اندھیرے میں لوگ گھوم رہے ہیں اور اندھیرے کے سمندر میں اپنے چہرے دیکھتے ہیں۔

اور پھر لوگ اور لوگ اور لوگ۔ ہزاروں لوگوں کی بھیڑ شاہراہ پر آگے بڑھ رہی تھی سمندر کے طوفان کی طرح پھیلتی جا رہی ہے: جے جے کار کے نعرے لگاتی، پرچم لہراتی اور ایک آدمی بھیڑ کے سامنے سے چلا آ رہا ہے، ایک پھٹا ہوا پھریرا لئے۔ الجھے ہوئے قدموں تلے دھرتی پھسل رہی تھی۔ بار بار بھیڑ کے ریلے سے وہ پیچھے دھکیل دیا جاتا تھا۔ پھر بھیڑ کے بھنور میں وہ پھنس گیا۔ لوگوں نے شور مچایا: راستے سے ہٹ جاؤ نہیں تو کچلے جاؤ گے لیکن وہ پریت زدہ روح کی طرح آگے ہی آگے بڑھتا جا رہا تھا وہ لوگوں کے پانو تلے روندا جا رہا تھا۔ وہ بار بار اٹھ کھڑا ہوتا اور پھر کچل دیا جاتا۔ اس کا چہرہ غصے اور حقارت سے لال ہو رہا تھا۔

اچانک بھیڑ میں کہیں سے ایک ہاتھ اٹھا، ایک خنجر بجلی کی طرح چمکا، ایک چیخ گ

آواز آئی۔ پرندے ڈر کے مارے درختوں سے اڑ گئے اور پھر یہ آواز بھیڑ کے فاتح شور میں کھو گئی۔

یہ تیسری لاش کیا اس کی ہے؟ جو کالے، پیلے، نیلے چہروں میں سے ابھر کر آئی ہے۔ ایک لاش روزانہ ہوتی، پھیلی ہوئی، لہو کا فوارہ اور دیر تک گونجتی ہوئی چیخ۔ اس نے پھٹی پھٹی نگاہوں سے چاروں طرف دیکھا۔

جب خنجر بجلی سا چمکتا ہے، گولی دل سے چلتی ہے۔ کوئی قتل ہوتا ہے۔ یا خودکشی کرتا ہے تو سناٹا چھا جاتا ہے؟ کیا زخم کی کوئی زبان نہیں ہوتی؟ زخم کے ہونٹ تو ہوتے ہیں، آواز کیوں نہیں؟

"پیس از رٹن آن دی ٹوراسٹیپ ان لاوا" میں نے ڈائری میں لکھا تھا۔

وہ ہاتھ کہاں ہیں؟ بے رحم، قاتل ہاتھ۔ لیکن اب وہاں کوئی نہیں تھا۔ لوگوں کا ہجوم آگے بڑھ چکا تھا۔ دشمن انجانا تھا، بے نام تھا، اندھیرے میں کھو چکا تھا اور وہ اپنے دشمن (وہ اسے اپنا دوست سمجھتا تھا جس نے اسے زندگی میں ہر لمحہ دہشت زدہ ہونے کی اذیت سے نجات دلائی تھی۔) کا شکریہ کبھی ادا نہیں کر سکا۔

میں نے ان ہاتھوں کو دیکھا ضرور تھا جنہوں نے اس کو قتل کیا تھا لیکن میں انہیں پہچان نہیں سکتا۔ یہ وہی ہاتھ تھے، اس بڑے لڑکے کے، جو ایک معصوم لڑکے کو پیٹ رہے تھے۔ یہ وہی ہاتھ تھے جو لاش کے ٹکڑے ٹکڑے کر کے ندی میں بہا رہے تھے۔ یہ وہی ہاتھ تھے جو اس اندھیرے میں ایک ساتھی کی ڈبل روٹی چرا رہے تھے۔

لیکن آج میں ان ہاتھوں کو نہیں پہچان سکتا۔ شاید اس لئے کہ میں مر رہا ہوں۔ (کیا میں واقعی مر چکا ہوں؟) صبح کی پہلی کرن کمرے میں چوری چھپے داخل ہوئی۔ یادیں دھندلی پڑتی جا رہی تھیں۔ اگر ان لاشوں کے بارے میں میں کچھ نہ جانتا تو بات کتنی سادہ ہوتی: محبت کی تثلیث — ایک عورت، دو مرد، قتل، خودکشی اور تپ دق۔ لیکن یہ تثلیث نہیں تھی کیونکہ میں بھی تو مردہ گھر میں موجود تھا — چوتھا آدمی۔ قدموں کی ہر آہٹ سے میں چونک جاتا۔ شاید کوئی میری لاش لینے آیا ہے۔

شام تک لوگ آتے رہے اور باری باری سب لاشیں لے گئے۔ اندھیرا گہرا ہوتا جا رہا تھا۔ کلاک نے تین بجائے۔ سناٹا ایک لمحے کے لئے ٹوٹا۔ اور پھر خاموشی۔ اس سنسان ٹھٹھرتی ہوئی سرد رات میں کون آئے گا؟ اور وہ بھی ایک مردے کے لئے۔ شاید کوئی لاش لینے آیا ہے۔ میں دروازہ کھولنے کے لئے اٹھتا ہوں اور گر پڑتا ہوں۔ کمرے میں کسی کے رینگنے کی آواز آئی۔ گھپ اندھیرا تھا۔ کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ آنے والے کی شاید آنکھ چمک رہی تھی۔ کیا سانپ کی بھی آنکھیں ہوتی ہیں؟ اس کی لال زبان شعلے کی طرح اندھیرے میں لپک رہی تھی۔ لیکن مجھے ذرا بھی ڈر محسوس نہ ہوا۔ سانپ میرے قریب آگیا اور پھن اٹھا کر کھڑا ہو گیا۔ صرف سانپ ہی زندہ تھا اور میں اکیلا پڑا تھا۔ میں چھت کو دیکھ رہا تھا جس کی نہ تو کڑیاں تھیں کہ گن سکتا نہ کھلا آسمان کہ تاروں کی چھاؤں ہی ہوتی

باہر دو آدمی باتیں کر رہے تھے:

"اس لاش کا کیا بنے گا؟ کوئی نہیں آیا"۔

دوسرا بولا: لاوارث ہے شاید"

میں نے آنکھیں بند کر لیں۔ دروازے پر زنگ لگا تالا لگا تھا۔ وقت کے سیاہ سمندر میں سفید بادبان پھیلا کے میری لاش کا جہاز صدیوں سے چل رہا ہے۔ اس کی نہ کوئی منزل ہے نہ ساحل۔

مجھے اندھیرے سے بہت ڈر لگتا ہے دوستو! اس اندھیرے میں کب سے بھٹک رہا ہوں۔ جہاں جہاں میں جاتا ہوں وہ میرے سامنے ایکدم آکھڑے ہوتے ہیں۔ بازار میں، گلی میں، موڑ پر، سیڑھیوں پر، ہر اس جگہ جہاں اندھیرا گہرا ہوتا ہے۔ بجلی کے کھمبے پر برہنہ عورت کی لاش کر اس کی طرح اٹھائے وہ میرے سامنے آکھڑا ہوتا ہے اور مجھ سے پوچھتا ہے: بتاؤ اس کا قاتل کون ہے؟ اور اچانک دوسری طرف سے کالے گھوڑے پر سوار شیطانی ہنسی ہنستا ہوا وہ آجاتا ہے۔ بھالے کی نوک پر بچے کی لاش اچھالتا ہوا وہ دونوں صدیوں سے میرے پیچھے گھوم رہے ہیں۔ میں کدھر

جاؤں ؟ اس گھنے اندھیرے میں مجھے کچھ سجھائی نہیں دیتا۔ اے خدا مجھے روشنی دو۔ لیکن خدا کہاں ہے ؟ اس کی لاش بھی تو دردہ گھر میں پڑی ہے۔

اوم نمو یروشلم ہیروشمو۔

●

مفرور

گلی کے موڑ پر مجھے وہ پھر مل گیا۔

"رکو" اس نے کہا۔

میں رک گیا۔ وہ میرے بہت قریب آ گیا۔ اس سے پہلے بھی وہ مجھے مل چکا تھا جب بھی میں بھرے پُرے بازار سے تنگ سڑک پر یا اس گلی میں مڑتا ہوں یا بائی لین میں داخل ہوتا ہوں وہ مجھے مل جاتا ہے اور روک لیتا ہے۔ نامعلوم کب سے وہ میرا تعاقب کر رہا ہے۔ وہ ہمیشہ اسی تاک میں رہتا ہے کہ جب بھی میں اکیلا ہوں یا کسی کم بھیڑ بھاڑ والی جگہ یا سنسان مقام پر ہوں، وہ مجھے روک لے۔ لیکن میں ہمیشہ اس سے دامن بچا کر نکل جانے کی کوشش کرتا ہوں۔ (مجھے تو یہ بھی شک ہے کہ وہ کبھی مجھ سے الگ بھی ہوا ہے؟)

لیکن اس بار اس سے جان بچا کر نکل جانا مشکل نظر آ رہا تھا۔ حالانکہ اس بار اس کے چہرے پر زیادہ نرمی تھی۔ ہونٹوں پر زیادہ مسکراہٹ تھی۔ آنکھوں میں پہچان کی حرارت تھی۔ لیکن اس کے ہاتھوں کی گرفت پہلے سے کہیں زیادہ مضبوط اور سخت تھی۔

"تم نے میرے سوال کا جواب نہیں دیا۔" اس نے کہا۔

"کس سوال کا؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔

"وہی۔ تم سے جدا ہونے کے بعد جب میں تم سے پہلی بار ملا تھا اور میں نے پوچھا تھا۔"

"تم مجھے کئی بار ملے ہو لیکن تم مجھ سے جدا کب ہوئے تھے! ہم اکٹھے ہی کب تھے"

میں نے کہا۔

"اوہ۔ تم یہ بھی بھول گئے کہ کبھی ہم اکٹھے بھی تھے۔ ہاں تمہارا یہ سوال جاننا ہے کہ میں تم سے جدا کب ہوا تھا میں تم سے ۳۰ اگست کو جدا ہوا تھا۔"

"کس ۳۰ راگست کو؟ میری عمر اس وقت چالیس برس ہے۔ اور میری زندگی میں چالیس ۳۰ راگست آچکے ہیں" میں نے کہا۔

"لیکن کیا ہر ۳۰ راگست اس سے پہلے برس کے ۳۰ راگست کی طرح تھا۔ یا آنے والے ۳۰ راگست کی طرح ہوگا۔" اس نے کہا۔

"آخر تم چاہتے کیا ہو؟ یہ پہیلیوں کی زبان میں کیا بول رہے ہو؟ تم کوئی فلسفی ہو یا بازیگر۔"

"میں نہ فلسفی ہوں، نہ بازیگر۔ کیا کہیں یہ دونوں تم ہی تو نہیں۔"

"کیا مطلب؟" میں نے پوچھا۔

"ایک بازیگر جو فلسفی ہونے کا بھرم دیتا ہے۔" اس نے کہا۔

"بازیگر میں نہیں، تم ہو جو ہر وقت دن رات میرا یوں تعاقب کرتے رہتے ہو۔"

"شاید یہ بھی صحیح ہو۔ لیکن اس سے اس بات میں کوئی فرق نہیں پڑتا کہ میں اپنے سوال کا جواب چاہتا ہوں۔"

"لیکن آخر تمہارا سوال ہے کیا؟" میں کچھ پریشان ہو گیا۔

اس نے جیب سے ایک دودھاری تیز چمکتی ہوئی چیز نکالی، اور میرے بازو پر اس کی نوک سے ہلکا سا دباؤ ڈالا۔

"چبھتی ہے؟ اس نے پوچھا۔

"ہاں"۔ میں نے خوف زدہ ہو کر کہا۔ شاید یہ آدمی مجھے قتل کرنا چاہتا ہے اور ایسے موقع کی تلاش میں ہے جب لوگوں کی نگاہوں سے دور کسی اکیلے مقام پر تنگ گلی کے اندھیرے میں میں تنہا ہوں، وہ مجھ پر حملہ کر دے اور اس دودھاری تیز چمکتی ہوئی چیز کی نوک میرے سینے میں گھونپ دے۔ موت کی پرچھائیں میرے سامنے ایک دم جھلک گئی۔ دہشت نے مجھے

جیسے جکڑ لیا۔ میں ایک جھٹکے سے اس سے بازو چھڑا کر بھاگ کھڑا ہوا۔ اور دوڑ کر تیزی سے سامنے چائے کی دکان میں گھس گیا۔ چائے خانے میں بیٹھے ہوئے لوگوں نے مجھے استعجاب کی نظروں سے دیکھا اور پھر چائے کی پیالیوں میں ڈوب گئے۔ باتوں کے شور میں لپٹا میں ایک کونے والی سیٹ پر دبک کر بیٹھ گیا۔ لیکن وہ دودھاری تیز چمکتی ہوئی چیز کی نوک کی چبھن اب بھی میرے بازو میں ہو رہی تھی۔ چائے خانے کے دروازے پر اس شخص کا چہرہ ابھرا اور پھر اس کا قد۔ اور وہ اندر آ گیا۔ اس کا قد پہلے سے زیادہ اونچا ہو گیا تھا۔

یا خدا یہ کون ہے؟ کوئی جن، بھوت، آسیب، قاتل، بازیگر، پہلوان یا خفیہ کا آدمی مخبر۔ یا محض ایک مسخرہ۔ مجھے اس آدمی سے بچاؤ۔ چائے خانے میں بیٹھے آدمیوں کی طرف میں نے دہشت بھری نظروں سے دیکھا۔ لیکن سب اپنی اپنی پیالیوں میں گم تھے۔ مختلف چھوٹی بڑی، موٹی بھدی، لال پیلی نارنجی، سیاہ باتوں کے بادلوں میں جو سگریٹوں کے دھوئیں میں لپٹی ہوئی تھیں، کچھ چمکتی، کچھ مدھم، کچھ مہکتی، کچھ بدبودار سانسوں پر تیرتی باتیں۔

وہ چپ چاپ آکر میرے سامنے کرسی پر بیٹھ گیا۔

"یہ بڑے دنوں سے ایسے ہی پڑی تھی۔ اسے زنگ لگنا شروع ہو گیا تھا۔ میں نے سوچا، کیوں بے کار جائے۔ اسے صاف کیا اور آج اسے اپنے ساتھ لے آیا ہوں۔ سوچا، تم سے اپنے سوال کا جواب بھی پوچھ لوں گا اور اگر۔۔۔"

"اگر تم نے مجھے قتل کرنے کی کوشش کی تو میں شور مچا دوں گا۔" میں نے کہا۔ "دیکھو یہاں کتنے سارے لوگ ہیں۔ اگر تم نے مجھ پر وار بھی کیا تو یہ اتنے سارے لوگ تم پر جھپٹ پڑیں گے اور پولیس کے حوالے کر دیں گے۔ تم بھاگ نہیں سکتے۔" میں نے دھمکی دی۔

"وار تو میں تم پر کر چکا ہوں۔" اس نے کہا۔ "بھول گئے اس دودھاری تیز چمکتی ہوئی نوک کی چبھن کو۔"

وہ بڑا نڈر تھا۔ شاید کوئی عادی مجرم تھا۔

"اور یہ لوگ تمہاری باتیں نہیں سنیں گے۔ انہیں اپنی باتوں سے ہی فرصت نہیں۔ اگر یہاں خون کی دھار بھی پھوٹ پڑے اور تمہاری لاش تڑپتی نظر آئے تو یہ ایک نظر دیکھیں گے۔ اور پھر اپنی باتوں میں مصروف ہو جائیں گے۔ یہ چائے خانے میں اکٹھے ہی اس لئے ہوئے ہیں کہ باتیں کریں۔ باتیں۔ باتیں۔ باتیں۔ ان کے لئے نہ کوئی قاتل ہے۔ نہ مقتول"

سرِ مقتل تماشا ہم آج بھی دیکھیں گے۔ چائے کی پیالی سے چند انچ اوپر جمے ہونٹوں سے آواز نکلی۔

تماشا فرور دیکھیں گے۔ لیکن مقتل کہاں ہے۔ یہاں نہ کوئی قاتل ہے نہ مقتول۔

اور اگر تمہیں الف اقتدار کی کرسی پر بٹھا سکتا ہے تو تم الف ہو۔"

ورنہ الف گر جاتا ہے۔

اور اگر الف گرے گا نہیں تو سکتہ پڑ جائے گا۔

اور بیچاری جنتا۔

جنتا کے لئے سوشلزم ہے۔ اوڑھے اور بچھائے سوشلزم۔

اور کھائے کیا؟

یہی شوشلزم۔

سوشلزم زندہ باد۔

انقلاب زندہ باد۔

بات قاتل و مقتول کی ہو رہی ہے۔ اور تم نعرے لگا رہے ہو۔ انقلاب زندہ باد۔

بات محض قاتل پر ہی ہو سکتی ہے

سرفروشی کی تمنا اب ہمارے دل میں ہے۔ دیکھنا ہے زور کتنا بازوئے قاتل میں ہے۔

یہ شعر سیاسی ہے۔ اس میں ادب نہیں۔ جمالیاتی حسن نہیں۔

آج تمام اقدار کا بھرم کھل چکا ہے ۔
اس لئے کوئی قدر نہیں ۔
(یہ بھی ایک قدر ہے کہ آج کوئی قدر نہیں ۔)
آج تمام سیاست اقتدار کی جنگ میں بدل چکی ہے ۔
اس لئے کوئی سیاست نہیں ۔ ہم سیاست سے دور رہیں گے ۔
(یہ بھی سیاست ہے ۔)
آج تمام آئیڈیولوجی باطل اور فریب کن ثابت ہو چکی ہے ایک آئیڈیولوجی کا خاتمہ تمام آئیڈیولوجی کا خاتمہ ہے ۔
کیوں ۔ میں پوچھتا ہوں ۔ کیوں ؟
اس لئے کہ لفظ اور معنی کا رشتہ ایک دوسرے سے ٹوٹ چکا ہے ۔
جنگ امن ہے ، جھوٹ صداقت ہے ، جہالت علم ہے ۔
یہ تم جارج آرویل کو بیچ میں کیوں گھسیٹ لائے
اس لئے کہ ۱۹۸۴ء میں اب صرف ایک برس باقی رہ گیا ہے ۔
اگر ہم چودہ برس بن باس لے لیں تو ؟
اگر تم بن باس بھی لے لو ۔ راج پاٹ بھی چھوڑ دو ۔ تو بھی راون سے تو جنگ کرنی ہی پڑے گی ۔ کیونکہ سیتا ہرن تو ہوگا ہی ۔
ہم دار سینا تیار کر لیں گے ۔
سونے کا ہرن ۔ شکار کا لوبھ نہ ہو تو سیتا ہرن نہیں ہوگا ۔
راون اگر سادھو کے بھیس میں نہ آئے تو بھی سیتا ہرن نہیں ہوگا ۔
لیکن اگر سب جیت جات کے واپس بھی آجاؤ تو بھی سیتا کی اگنی پریکشا لینی پڑے گی ۔
اور اگر وہ اس میں بھی سرخرو ہو کر نکلے تو ؟
تو اس کا بن باس ۔

بن باس ہر صورت میں لازمی ہے. چاہے رام کا ہو یا سیتا کا.
دھوبی تو شک کرے گا ہی اور پرجاتنتر کی لاج رکھنے کے لئے ــــ اور پھر
اشومیدھ یگیہ.
یار چھوڑو. ان باتوں کو. کہاں کی رامائن لے بیٹھے.
کوئی بات کرو. اس دور کی. آج کی.
اس دور میں تو ہم سب ہپی ہیں. فلاور چلڈرن. کرنا ڈجنریشن. گانجا. افیم
چرس. ایل. ایس. ڈی. مہاری پوتا.
برٹرینڈ رسل سردیوں کی برفانی رات میں یخ بستہ پتھر پہ بیٹھ کر دھرنا دیتا
ہے. عالم پیری میں. اور بیٹل جان لینان اپنی جاپانی بیوی کے ساتھ بستر
پر لیٹ کر امن عالم زندہ باد. ویٹ نام کی جنگ بند کرو. ایٹم بم پہ پابندی
لگاؤ. ہیروشیما. ہیروشیما. ہیروشیما.
(انقلاب بستروں پر)
آوازیں. آوازیں. آوازیں. آوازیں. آوازیں.
اوم شانتی. شانتی.
ہرے کرشن. ہرے کرشن. کرشن کرشن. ہرے ہرے.
چائے میں طوفان زندہ باد.
طوفان میں چائے زندہ باد.
لوگ ایکدم اٹھ کھڑے ہوئے. اور جلوس کی شکل میں باہر نکل گئے.
باہر چند نوجوان گاتے بجاتے اپنی دھن میں مست چلے جا رہے تھے.
یہ لوگ تنہائی کے ڈسے ہوتے ہیں.
دہشت کے مارے ہوئے.
ایلی نیشن کا شکار.
آئی ڈنٹیٹی کی تلاش میں.

ذات کی پہچان میں۔
اجنبی۔
سِمی فس۔
(پرومیتھیس نہیں)
قسم قسم کے لوگ
مارکس۔ سقراط۔ برٹرینڈ رسل۔ اسٹالن۔ لینن۔ گاندھی۔ ماؤ۔ ہوچی مینہ۔
بھگت سنگھ۔ نہرو۔ چی گوارا۔ ڈب چیک۔
لوگ۔ لوگ۔ لوگ۔ لوگ۔ لوگ۔
کچھ بیگ میں گا نجا لئے۔ کچھ گلے میں مالا ڈالے۔ کچھ پھول کی ٹہنی لئے۔ کچھ زیتون کی شاخ لئے۔ کچھ بارود کے گولے لئے۔
"لیکن ان سب باتوں سے میرا کیا تعلق؟" میں نے خوفزدہ ہو کر کہا۔
"لو چائے پیو۔ ٹھنڈی ہو رہی ہے۔" (طوفان میں چائے۔ زندہ باد۔ چائے بیں طوفان زندہ باد۔)
میں نے جلدی جلدی چائے کی پیالی ختم کی۔ زہر۔
چائے خانے میں میرے اور اس کے سوا اب کوئی نہ تھا۔
"تمہارا اس سے کوئی تعلق نہیں۔" اس نے جیسے مجھے دھمکاتے ہوئے کہا۔
اس نے جیب سے دو دھاری تیز چمکتی ہوئی چیز نکالی۔ میرے بازوؤں میں انگلی تک جھنجھن ہو رہی ہے۔
"تمہارے بال سفید ہو رہے ہیں تم کتنے خوبصورت تھے۔ دبلے پتلے لیکن پھر بھی چارمنگ۔ کچھ کچھ موٹاپا آ رہا ہے۔" اس نے کہا۔
"تم مجھے کب سے جانتے ہو؟"
"بڑی مدت سے۔ غالباً میرا اور تمہارا جنم ایک ہی ساتھ ہوا تھا۔ لیکن تمہاری پہچان دس پندرہ برس بعد ہوئی تھی۔ جب تم گرمیوں کی چلچلاتی

دھوپ میں چپل پہنے تنگے سر گانو گانو شہر کی گلیوں اور سڑکوں پر گیہوں، چاول، کپڑا، پیسہ اکٹھا کر رہے تھے۔ اور تمہارے ہونٹوں پر سیدھے سادے الفاظ تھے۔ پورب دیش میں ڈگی باجے۔ بھوکا ہے بنگال رے ساتھی بھوکا ہے بنگال — اور جب کسی نے کہا تھا کہ قحط اور فساد پر نظمیں، افسانے لکھنے سے تو بہتر ہے کہ ننگی تصویروں کا البم دیکھا جائے۔ ادب علاج الغربا نہیں تو تم نے یہی دو دھاری تیز چمکتی ہوئی چیز نکال لی تھی۔ یاد ہے نا۔"

میں نے دو دھاری تیز چمکتی ہوئی چیز کی طرف دیکھا۔ یہ میری جانی پہچانی تھی۔ لیکن یہ اس کے پاس کیسے پہنچ گئی؟

"تم نے یہ دو دھاری چمکتی ہوئی چیز ایک بار اور بھی نکالی تھی۔" اس نے کہا۔

"شاید۔ مجھے یاد نہیں۔"

جب دیش بھر میں چاروں طرف نعرے گونج رہے تھے۔ انگریزو ہندوستان چھوڑ دو۔ گرفتاریاں ہو رہی تھیں اور تم نے ریلوے لائن پر بم رکھا تھا۔ اس وقت شاید میں نے تمہیں روکا تھا کہ یہ بم تم فوجی گاڑی کے لئے رکھ رہے ہو۔ لیکن ممکن ہے کوئی سواری گاڑی آجائے۔ جس میں ہمارے ہی بھائی ہوں۔ تم نے شاید مجھے غدار سمجھا اور تم نے یہ دو دھاری چمکتی ہوئی چیز نکال لی تھی۔ تم نے مجھے غلط سمجھا تھا۔ شاید ہم دونوں نے ایک دوسرے کو پہچاننے میں غلطی کی تھی۔ کیونکہ یہ ایک ایسا دور تھا جب ایک ہی آدمی کہہ رہا تھا۔ لڑنے والے سپاہی سے پوچھو کہ وہ کہاں جا رہا ہے اور وہی آدمی کہنے لگا۔" یہ جنگ ہے جنگ آزادی۔ آزادی کے پرچم کے تلے۔"

یہ آدمی ضرور خفیہ کا آدمی ہے جو میری ساری زندگی کی روداد سے واقف ہے۔ شاید وہ مجھے حراست میں لینا چاہتا ہے۔ خوف کا اندھیرا گہرا سیاہ ہوتا جا رہا تھا۔

"لیکن تم نے یہ دودھاری چمکتی ہوئی چیز مجھ سے کب حاصل کی ؟" حالانکہ میں کہنا چاہتا تھا کب چرائی ؟ لیکن میں اس سے ڈر گیا تھا۔

"میں نے چرائی نہیں" وہ بولا شاید وہ میرا مدعا سمجھ گیا تھا۔

"تم نے خود ہی مجھے سونپ دی تھی۔"

"کب ؟"

"فسادوں کے بعد جب تم نے سڑکوں پر جمے ہوئے خون کو دیکھ کر کہا تھا۔ یہ دودھاری تیز چمکتی ہوئی چیز اب بیکار ہے۔ یہ کسی کا قتل نہیں کر سکتی۔ خون نہیں بہا سکتی۔ محض چھین دے سکتی ہے۔ سڑک کے کنارے ایک کم سن بچے کی لاش ہے۔ تم نے یہ چیز اس کی لاش کے پاس رکھ دی۔ اور انسان مرگیا۔ جیل میں تم نے کہا تھا نا کہ ڈبل روٹی کے ٹکڑے چرانے والے برسراقتدار آنے پر انسان کی ہر چیز چھین سکتے ہیں۔"

اب میرے سامنے کوئی چارہ نہیں تھا کہ اس آدمی کے سامنے سب کچھ اعتراف کر لوں اور اپنے آپ کو اس کے حوالے کر دوں۔

"تم مجھے چھوڑ دو۔ میرے حال پر رحم کرو۔ میری بیوی ہے، بچے ہیں۔ ان کا مستقبل برباد ہو جائے گا۔" میں نے گڑگڑاتے ہوئے کہا۔

"تمہاری بیوی بڑی خوبصورت ہے۔ باسلیقہ باشعار اور بچے بڑے ہی کیوٹ۔ ایک روز میں تمہارے گھر گیا تھا۔ تمہاری تلاش میں۔"

"کب ؟"

اس شخص نے میرا گھر بھی دیکھ رکھا ہے۔ اوہ میرے خدا۔

"تمہارا فرج امپورٹڈ ہے نا ؟"

"ہاں" میں نے کہا۔

"تم اس روز گھر پر نہیں تھے۔ تمہارے ایرکنڈیشنڈ ڈرائنگ روم میں میں نے ریڈیو گرام پر روی شنکر کا گیت سنا۔ ایک پیالی کافی پی۔ تھوڑا انتظار کیا۔

ادھر چلا آیا۔

" دیکھو۔ میں ہر وقت اس خوف میں مبتلا رہتا ہوں کہ نا معلوم تم کب کہاں مجھے مل جاؤ۔ تمہارا ڈر سرد لوہے کی سلاخ بن کر میری روح میں گڑ گیا ہے۔ مجھے چھوڑ دو ورنہ میں مر جاؤں گا اور اگر ۔۔"

" اور اگر نہ مرا تو خودکشی کر لوں گا"۔ اس نے کہا۔

" ہاں، خودکشی کر لوں گا"۔ میں نے چڑ کر کہا۔

" مرنے کا تمہیں اور کوئی راستہ معلوم نہیں"۔ اس نے طنز کیا۔

" معلوم ہے"۔ اب میں اس کا مقابلہ کرنا چاہتا تھا۔ اب مجھے مکمل احساس ہو گیا تھا کہ اس سے نجات کا کوئی راستہ نہیں یا وہ مجھے ختم کر دے گا، یا میں اس کا گلا گھونٹ دوں گا۔

" کسی ریل کے حادثے میں ۔ جنگ میں گولی کھانے سے ۔ بستر پہ پڑے پڑے کینسر سے۔ حرکتِ قلب بند ہو جانے سے۔ وبائے عام میں"۔ میں نے کہا۔

" کینسر سے تمہارے مرنے پر مجھے کوئی اعتراض نہیں لیکن تمہارے وبائے عام میں مرنے پر مجھے ضرور رنج ہو گا"۔ اس نے کہا۔

" تو پھر کینسر سے مر جاؤں گا"۔

" کیا تمہیں اختیار ہے کہ تم کس مرض میں مرو گے؟"

کیوں نہیں۔ میں زیادہ سگریٹ پیوں گا۔ میں پوری تمباکو کھاؤں گا اور ۔"

" دیکھو دوست اس طرح الجھنے سے کوئی فائدہ نہیں اگر مجھے تمہارا مرنا ہی پسند ہوتا تو تمہیں مرنے سے کوئی نہیں روک سکتا۔ دراصل میں تمہیں مرنے سے بچانے ہی کے لئے تمہارا تعاقب کر رہا ہوں"۔ لیکن میں مر کہاں رہا ہوں۔ مجھے کوئی مرض نہیں میں مکمل طور پر تندرست ہوں۔ دیکھو۔"

" تم کینسر کا شکار ہو چکے ہو"۔ اس نے کہا۔

" جھوٹ۔ بالکل جھوٹ"۔

تم جانتے ہو کہ کینسر چوری چھپے تمہارے اندر گھر کر لیتا ہے اور خبر تک نہیں ہوتی۔ اس لئے تم اس سے غافل ہو۔"

"جھوٹ۔ بالکل جھوٹ۔"

"یہ سچ ہے۔" اس نے گرجتے ہوئے کہا۔

وہ مجھ پر جھپٹا۔ میں بھیڑ بھاڑ سے بچتا بچاتا بھاگا جا رہا تھا۔

"تو تم نے میرے سوال کا جواب نہیں دیا۔" اس کی آواز بلند ہوتی جا رہی تھی۔

"تو تم اپنے سوال کا جواب چاہتے ہو۔" میں پلٹا۔ اور میں نے اس کا گلا دبوچ لیا اور اس نے میرا۔ ہم دونوں کے ہاتھوں کی گرفت ایک دوسرے کے گلے پر مضبوط ہوتی جا رہی تھی۔ اور مضبوط۔ اور سخت لیکن نہ وہ مر رہا تھا اور نہ میں۔ اور جب تک ہم دونوں میں سے کوئی نہیں مرتا۔ اس کا سوال باقی رہے گا۔ اور یہ سوال صلیب بن کر میرے کندھے پر لٹکا رہے گا۔ جس کا بار نہ میں اٹھا سکتا ہوں۔ اور نہ پھینک سکتا ہوں اور نہ لٹک سکتا ہوں۔

بس بچے کے لئے محض بھاگ سکتا ہوں۔ ●

کینوس کا صحرا

میں کمرے میں داخل ہوا۔ کمرے میں بڑا حبس تھا۔ گرم اندھیرا تھا۔ کمرے کی کائنات میں باسی بو بسی ہوئی تھی۔ ایک چھوٹا سا دریچہ تھا جس سے روشنی کی کچھ امید ہو سکتی تھی۔ اسے بھی گہرے نیلے پردے سے بند کر دیا گیا تھا۔ اور چیزیں ایک دوسرے سے دست و گریباں ہو کر مات کھا کر مدہوش پڑی تھیں۔

باہر لو چل رہی تھی۔ اور تیز چمکدار دھوپ شیشہ سا جھلک کر آنکھوں میں چبھ رہی تھی۔ بن پکاسو ویسٹ پیپر باسکٹ پر بیٹھا کورے کینوس پر نیم غنودگی کی حالت میں انگلیاں پھیر رہا تھا۔

"جناب بن پکاسو۔ جلدی پانی لاؤ۔ پیاس سے بے حال ہو رہا ہوں۔ یہ گرمی تو مار ڈالے گی۔ میں نے کہا۔

"پانی! پانی نہیں ہے۔" بن پکاسو نے کہا۔

"تھوڑا پانی، ایک گھونٹ پانی۔ صرف چند بوندیں۔"

"پسینہ پی لو، ذرا کھاری ہوتا ہے۔ اور کوئی بات نہیں۔ جلدی ورنہ وہ بھی سوکھ جائے گا۔" بن پکاسو بولا۔

"یو سوائن"!

سنو ڈیئر۔ برف اور دھوپ میں کیا فرق ہے؟" اس نے اچانک پوچھا۔

"برف سرد ہوتی ہے۔ اور دھوپ گرمی" میں نے کہا۔

"برف بھی سفید ہے اور دھوپ بھی" اس نے کہا۔
"تم ہمیشہ رنگوں میں ہر چیز کیوں دیکھتے ہو؟"
"اس لئے کہ رنگ ہی دائمی حقیقت ہے۔ اور رنگ بھی تو سرد اور گرم ہوتے ہیں" وہ بولا۔
"لیکن دھوپ اور برف کی مناسبت سے نہیں" میں نے کہا۔
"میں ہر چیز کا رنگ دیکھتا ہوں۔ برف اور دھوپ دونوں کی چمک بڑی پیاری ہوتی ہے" اس نے کہا۔
"برف منجمد پانی نہیں۔ منجمد دھوپ ہے۔ دھوپ کی SLAB ہمیشہ گرمی کی صنعت۔
"تم مجھے پاگل بنا رہے ہو" میں نے کہا۔
"پاگل! تم بلا تمیز دھوپ میں گھوم کر آتے آئے ہو۔ اسلئے ذرا سر گھوم گیا ہے۔ کیا لائے ہو۔ صفر محض۔ اور کمرے میں دھوپ میں جلی ہوئی چیزیں ہیں۔ اور صفر محض" بن پیکا سو کہہ رہا تھا۔
"مجھے پانی چاہیئے۔ ورنہ میں مر جاؤں گا۔ تم کتنے بے رحم ہو"
"اسی طرح ساری دنیا مر جائے گی، اپنی ہی پیدا کی گئی گرمی سے جب درجۂ حرارت کتنے فارن ہیٹ پر پہنچ جائے گا" وہ بولا۔
"معلوم نہیں"
"HEAT DEATH" اس نے کہا۔
لیکن اس سے پہلے تو دنیا ہائیڈروجن بم کے دوزخ میں جل چکی ہو گی" میں نے کہا۔
مارلن منرو کی تصویر سے اڑ کر چڑیا ایزل پر بیٹھ گئی۔ اور پھر اپنی چونچ کھولے بن پیکا سو کے سر پر اور پھر جیسے ایک دم تڑپ کر اٹھی اور بدھ کے مجسمے پر جا بیٹھی۔ وہاں سے اڑی تو سیدھی باتھ روم کے روشندان سے اندر چلی

گئی۔ میں پانی کی تلاش میں باتھ روم کی طرف لپکا۔ باتھ روم کا دروازہ جھٹکے سے نکلا۔ سامنے دیوار پر لٹکے شیشے میں میرا جھلسا ہوا چہرہ تھا۔ بکھرے ہوئے بال۔ دھول سے اٹا چہرہ قیامت سے پہلے دنیا کا آخری آدمی اور۔ اور اس چہرے پر ایک اور چہرہ منعکس تھا۔ سِنک (SINK) میں ٹانگیں باہر لٹکائے وہ بیٹھی تھی۔ پتلی ننگی مرجھائی ہوئی بے جان ٹانگیں۔ موت میرے سامنے سِنک میں دھنسی ہوئی تھی۔

"بن پکاسو" میں چلایا۔

"ڈرو مت۔ لڑکی نہیں ماڈل ہے"۔ وہ بولا۔

"لیکن یہ تو مر چکی ہے"۔ میں نے کہا۔

"مری نہیں" مرنے سے پہلے کا چہرہ ہے"۔

"لیکن؟" میں خوف سے تھرا اٹھا۔

بن پکاسو باتھ روم میں داخل ہوا۔

"تم اتنا گھبرا کیوں جاتے ہو؟ لڑکی سے، موت سے، چڑیا سے، گرمی سے۔ جیسے دنیا تمہارے سامنے فنا ہو رہی ہے۔ اور تم اس مسمار شدہ دنیا کے آخری آدمی ہو"۔

"بے سہارا، تنہا، بے یار و مددگار"۔

"اگر دنیا فنا ہو جائے گی تو میں کب زندہ رہوں گا"۔

"ارے یہی تو تمہاری دہشت کا باعث ہے کہ اگر سب مر گئے اور صرف تم زندہ رہ گئے تو کیا ہوگا۔ اس نے کہا۔

"میں تمہیں بتاؤں اس لڑکی کے چہرے میں کیا نظر آتا ہے؟" اس نے اچانک پوچھا۔

"گرمی میں جھلسا ہوا چہرہ، پیاس سے بدحال"۔

"اور"

"تنہا۔ بے یار و مددگار، خوف زدہ، شکستہ"۔

"ہوں۔ تو یہ چہرہ کس کا ہے؟"۔

"میرا" میرے منہ سے بے اختیار نکل گیا۔

"میں دراصل تمہاری تصویر بنا رہا ہوں۔ یہ میرا ماڈل ہے۔ اسے پانی نہیں ملے گا۔ اور یہ پیاس سے تڑپے گی یعنی تڑپتی رہی۔ اور کمرے کے حبس یعنی حبس بےجا میں HEAT EXHAUSTION کا شکار ہو جائے گی۔ یعنی ہو گئی۔
اس کے چہرے پر موت کی دہشت ہے۔ وہ کچھ نہیں بولی۔ میں نے اس کی کوئی آواز نہیں سنی۔ وہ چوپٹ کھولے عالم بے قراری میں بھٹکتی رہی اور باتھ روم کی طرف بھاگی پانی بند ہو چکا تھا۔ ایک قطرہ نل کے منہ پر لرز رہا تھا۔ گرے یا سوکھ جائے۔
اس نے ہونٹ کھولے چڑیا آئی اور پھر سے پانی کا قطرہ لے گئی۔ اور دوسرا قطرہ۔
آخری اس کے گالوں پر لوٹ گیا۔ اور—"

"تم آرٹسٹ ہو کہ سائنس داں یا—"

"اذیت پرست" بن پکاسو زور سے چیخا۔ "YOU-ARE-A-ROGUE"
میں چلایا۔

"اس لق و دق صحرا میں جہاں دور دور تک پانی نہیں وہ سنک میں بیٹھ گئی۔ اور اس کی ٹانگیں سنک کے باہر لٹکنے لگیں اور پورے جسم سے ٹانگوں کا رشتہ ٹوٹ گیا۔ اور معلوم ہے اس کے آخری الفاظ کیا تھے؟"

"کیا؟"

میں ڈوب رہی ہوں۔ بچاؤ۔ مجھے بچاؤ۔" اب گیان ملا کہ برف اور دھوپ میں کیا فرق ہے"۔ بن پکاسو زور سے ہنسا۔

"میں اسے مرنے نہیں دوں گا" میں چلایا۔

"اسے مار کون رہا ہے"۔

"تم نے اسے مار ڈالا ہے"۔

"لاؤ پیسے۔ برف لاؤں۔ میں نے کہا۔

"پیسے" وہ پھر ہنسا۔ مائی ڈیئر۔ یار تم اپنا اچھا سا کوئی نام رکھ لو۔ یہ بار بار مائی ڈیئر کہنے میں بڑی کوفت ہوتی ہے۔ تو ڈیئر اسی لئے ان مادام کو زحمت دی گئی ہے کہ وہ ماڈل بنے اور میں تصویر بناؤں۔ اور کچھ پیسے آئیں"

"لیکن تمہاری تصویر خریدیگا کون"

"لیکن اسے بیچنے کے لئے کون بنا رہا ہے۔ ظالم۔۔۔ یہ تو۔ اس کمرے کی دیوار پر آویزاں رہے گی۔ یہ لڑکی مر بھی جائے گی تو تصویر زندہ رہے گی۔ اس لئے نہیں کہ آرٹ ابدی ہے۔ اس لئے کہ دیوار مستقل حقیقت ہے یہ انسان کی دیوار ہے۔ میرا مطلب ہے تصویر ہے۔ ازل سے ابد تک تم اور تمہارے سب دوست صدیوں سے یہ دیوار بنا رہے ہیں۔ ایک انسان سے دوسرے انسان تک۔ لیکن سب کا حشر ایک ہے۔ HEAT DEATH۔ تم نے دیکھا وہ عکس ہیروشیما کی چٹان پر آدمی جھلس کر اس پر منعکس ہو گیا۔ آگ اگلتی گرمی میں انسان کی کیا صورت ہوتی ہے۔ ہیروشیما کا بم ہم سب سے بڑا فنکار ہے"۔

"بن پکاسو۔ اس گرم اندھیرے کے پاتال سے باہر نکل آؤ ورنہ تمہارا بھی یہی حشر ہوگا"۔ میں نے کہا اور باہر کی طرف دوڑا۔

پانی! لیکن پانی کہاں ہے؟ سامنے ریستوران سے تھوڑی سی برف لے آؤں۔ اور پانی کا ایک گلاس۔ لیکن کیا وہ پانی دیگا۔ ابھی تو اس کا پچھلے دو ماہ کا بل بھی نہیں چکایا۔

پڑوس میں مسٹر۔ کیا نام ہے اس کا۔ بہرحال ہیں۔ ان سے پانی مل سکتا ہے۔ لیکن!

ہمارے کمرے کی پیلی روشنی رات رات بھر جلتی رہتی ہے۔ اور ہم بہت اونچی اونچی باتیں کرتے ہیں۔ اور ہمارے کپڑے باہر تار پر سوکھتے رہتے ہیں اور ہوا سے اڑ کر ان کے آنگن میں ان کے کپڑوں سے جا ملتے ہیں۔ ایک بار

انہوں نے بن پکاسو سے شکایت کی کہ کپڑوں کو صرف لٹکایا کرو۔

بن پکاسو نے کہا۔ ہمارے پاس صرف نہیں ہیں مادام۔ ورنہ ہم اپنے ہاتھ منہ اور دماغ پر بنہ لگا دیتے۔ مادام نے کہا کہ پھر تار سے باندھ دو۔ جی "۔

" بن پکاسو نے رونی صورت بنا کر کہا۔" ہمیں کپڑوں کو پھانسی پر لٹکانا اچھا معلوم نہیں دیتا۔ اگر آپ چاہیں تو ہم کپڑے پہننا چھوڑ سکتے ہیں۔"

اس پر مادام بڑی ناراض ہوئیں اور انہوں نے پولیس میں شکایت کی دھمکی بھی دی کہ پڑوس میں یہ لوگ بڑا اودھم مچاتے ہیں۔ اودھم کے بجائے انہوں نے ایک دوسرے لفظ کا استعمال کیا تھا جو ہماری پارلیمنٹ کے خلاف تھا۔

بن پکاسو نے وہیں کھڑے کھڑے ڈرائنگ ٹیبل کے کپڑے پر کوئلے سے ان کی تصویر بنا دی تھی۔ مادام شاید آرٹ کی قدردان تھیں یا اپنے حسن پر فدا نرگسیت کی۔ انہوں نے تصویر رکھ لی اور کپڑے واپس کر دیئے۔ سنا ہے کہ وہ اپنے ملنے جلنے والوں کو بتاتی ہیں کہ جب وہ پیرس گئی تھیں تو وہاں کے مشہور فنکار جس کا نام وہ اکثر بدل دیتی تھیں عورتوں کے رسالے پڑھنے کے بعد میں نے ان کی یہ تصویر بنائی ہے۔ دریائے سین کے کنارے جب وہ سن باتھ کر رہی تھیں۔

یہ بن پکاسو کم بخت لباس کے اندر بھی کیسے جھانک لیتا ہے؟" میرا نام۔ خیر نام چھوڑیئے۔ میں بن پکاسو کا دوست ہوں۔ بن پکاسو جس نے آپکی یہ تصویر بنائی ہے۔ وہ سامنے دیوار پر کپڑے کے اوپر۔"

"یہ تصویر بن پکاسو نے نہیں پکاسو نے بنائی ہے" مادام نے کہا۔

" جی ہاں۔ وہی پکاسو۔ میں اس کا دوست ہوں۔ وہ اس وقت

پیاس سے تڑپ رہا ہے۔ پیاس مجھے بھی بڑی سخت لگی ہے۔ اور اس کا ماڈل تو قریب قریب سمجھئے مرچکا ہے۔ HEAT EXHAUSTION اور سنک میں اس کی ٹانگیں لٹک رہی ہیں۔ اور نل سب بند ہو چکے ہیں۔

مادام نے مجھے بڑے غور سے دیکھا اور پھر اندر چلی گئیں اور فرج سے ایک بوتل نکالی۔

پانی دیکھ کر میری زبان باہر نکل آئی۔ میں نے بوتل کا کارک کھولا اور پھر باتھ روم کے آئینے میں میرے چہرے پر پڑا ایک اور چہرہ میرے سامنے لہرا گیا۔ میں نے کارک بند کر دیا۔ اور بوتل کے باہر سرد شیشے پر زبان پھیری۔ بوتل کتنی برف تھی۔ بڑی راحت ملی۔

"مادام اگر تھوڑی سی برف بھی مل جائے تو عین عنایت ہو گی۔" میرا حوصلہ بڑھ گیا۔

مادام نے برف کے CUBS بھی دیدئے۔ میں نے پتلون سے اپنی قمیض باہر نکالی اور برف کے ٹکڑے اس میں بھر لئے۔

مادام جو پہلے غصّے میں تھیں۔ میری اس حرکت پر مسکرا دیں۔

"کیا تم اس دنیا کے باشندے ہو۔ اور تمہارا دوست بن پکاسو ——"

"YES - VERY MUCH - MADAM" میں نے کہا اور اپنے کمرے کی طرف بھاگا۔

ہم نے ماڈل کو سنک سے نکالا اور باتھ روم کے باہر فرش پر لٹا دیا۔ فرش بڑا گرم تھا۔ بن پکاسو نے اسے اپنے کینوس پر لٹا دیا۔

"بہت خوب" "ایک مکمل تصویر۔

"بن پکاسو نے کہا۔

میں نے کمرے کی کھڑکی اور دروازے کھول دئے۔ لو کے تیز جھونکے ہمیں ڈھونڈنے لگے۔ میں نے جلدی سے سب دروازے بند کر دئے۔ ماڈل کے ماتھے۔ چہرے اور جسم پر برف کے چھوٹے چھوٹے CUBS پھسلنے پگھلنے لگے۔

پانی کی سرد بوندیں اس کے قدرے نیلے اور ہلکے گلابی رنگ پر بڑی خوبصورت جھلک رہی تھیں۔

بن پکاسو نے اس کے ہونٹ کھولے اور دھیرے دھیرے پانی کی بوندیں منہ میں ٹپکائیں۔ میں ایک پنکھے سے اس کے چہرے پر ہوا کرنے لگا۔

"ارے بدھو۔ یہ کس سے ہوا کر رہے ہو؟" بن پکاسو نے میرے ہاتھ سے لیتے ہوئے کہا۔

"یہ تو ماڈرن آرٹ پر ایک خاص نمبر ہے۔"

"کوئی اور چیز ڈھونڈو۔"

مجھے اور کچھ نظر نہ آیا۔ بن پکاسو نے اپنی قمیص اتاری اور ہوا کرنے لگا۔ مجھے قمیض میں برف لینے کا خیال۔ اور مادام کا جملہ بھی۔

"تم کس دنیا کے باشندے ہو۔ تم اور تمہارا دوست بن پکاسو۔"

میں نے وہی فقرہ دہرا دیا۔ تم کس دنیا کے باشندے ہو؟" اس دنیا کے جو ہماری آنکھوں کے سامنے HEAT DEATH کا شکار ہونے جا رہی ہے وہ بولا۔

ماڈل کے جسم میں حرکت ہوئی۔ اس نے اپنے ہونٹوں پر زبان پھیری اور آنکھیں کھولنے کی کوشش کی۔ اس نے ہماری طرف دیکھا۔ ہمیں پہچاننے کی کوشش کی۔ بن پکاسو پھر اپنے کینوس کے سامنے ویسٹ پیپر باسکٹ پر بیٹھ گیا۔ ماڈل کینوس سے اٹھ کر فرش پر آ گیا تھا۔ کینوس بالکل خالی تھا۔ بالکل سفید۔

ماڈل نے کینوس پر نگاہ ڈالی اور پھر کمرے میں چاروں طرف۔ اور پھر بن پکاسو پر۔

"آرٹسٹ۔ تم نے میری تصویر نہیں بنائی۔ کتنی دیر میں تمہارے سامنے بیٹھی رہی۔ کیوں شاید میرے جسم، میرے چہرے میں کوئی کشش نہیں۔ کیا میں خوبصورت نہیں۔ شاید تم مجھے اس لئے لائے ہو کہ اتنے کم پیسوں پر کوئی ________ PROFESSIONAL MODEL نہیں مل سکتا۔ وہ اٹھ کر چلنے کو تیار ہونے لگی۔

فرش پر پانی کی بوتل پڑی ہے۔ میں نے اسے اٹھانے کے لئے ہاتھ بڑھایا۔ باتھ روم کے روشندان سے وہ چڑیا پھرتی سے آئی اور بوتل پر بیٹھ گئی۔ میں نے اسے ڈرایا وہ ڈر کر اڑی اور فرش پر بوتل اوندھے منہ گر پڑی۔

پانی۔!

بن پکاسو کی انگلیاں کینوس پر تیزی سے حرکت کرنے لگیں۔ وہ کوئلے سے بے ہنگم لکیریں کھینچ رہا تھا۔ سفید صحرا میں گرم لوہے کی بیڑیاں بج رہی تھیں۔ لکیریں ہی لکیریں۔ کالی سیاہ لکیریں۔ لیکن ان میں اس ماڈل کا چہرہ کہاں ہے۔

آج اتنے برس بیت جانے پر بھی میں ان کالی سیاہ پٹڑیوں میں اس کا چہرہ تلاش کر رہا ہوں۔

اور بن پکاسو کہاں ہے؟ سنا ہے وہ کسی قصبے کی دھول بھری سڑک پر پانی کا پیاؤ لگائے بیٹھا ہے۔ اور اس نے تصویریں بنانا چھوڑ دیا ہے۔

ایک پری کتھا

وہ میرا تھی۔ سونے میں جڑی پریتما۔

یہ محض اتفاق ہی تھا کہ اتنے برسوں بعد میرا سے میری ملاقات ہو گئی جب سے رام بابو کی موت ہوئی تھی۔ میرا اپنے چاچا کے ہاں چلی گئی تھی۔ اس کے بعد معلوم نہیں اس کا کیا ہوا۔ اور یہ تعجب کی بات ہی تھی کہ میرا کی شادی اتنے بڑے گھرانے میں ہوئی تھی۔ جس طرف نگاہ جاتی تھی سونے چاندی کی روشنی آنکھوں کو خیرہ کر رہی تھی۔ میں ایک مقدمے کے سلسلے میں یہاں آیا تھا۔ اور میرے موکل نے مجھے ڈنر کی دعوت دی تھی اور یہ موکل کشن پرشاد، میرا کا خاوند تھا۔ میں اندازہ کر سکتا کہ وہ کتنا متمول ہوگا۔

کھانے کی میز پر باتیں چل نکلیں۔ میں نے بتایا کہ میں رام بابو کے گہرے دستوں میں سے ہوں۔ شاید ہی کوئی شام ایسی نہ رہی ہو جب ہم نے کافی یا چائے نہ پی ہو۔ میرا کو میں اُسے بچپن سے ہی جانتا ہوں۔ اب وہ اتنی بڑی ہو گئی ہے۔ حیرت ہوتی ہے اسے دیکھ کر۔ میرا کا خاوند روئی اور لوہے کا بہت بڑا بیوپاری تھا۔ میں نے پوچھا۔

”کشن پرشاد جی۔ اگر ایک طرف ایک من روئی ہو اور دوسری طرف ایک من لوہا۔ تو روئی بھاری ہوگی یا لوہا؟“

”ویسے تو لوہا بھاری ہونا چاہیئے۔ لیکن آپ پوچھ رہے ہیں تو روئی بھاری ہوگی۔“ کشن پرشاد بولے۔ میں مسکرا دیا۔

میرا نگاہ نیچے کئے کھانے میں مصروف رہی۔ اس کے چہرے پر کوئی آشارہ نہیں تھا۔ کشن پرشاد کے باپ کو ایکدم رام بابو کی یاد آ گئی۔ بولے ”آپ تو رام بابو کے جگری

دوست تھے۔ آپ تو جانتے ہی ہیں کہ وہ کتنے وِدوان تھے۔ لیکن —"
وہ تھوڑی دیر کے لئے رکے " انہوں نے ساری زندگی یونہی گنوا دی۔ اگر کوئی ڈھنگ کا کام کرتے —" میں نے دیکھا میرا کے گلے میں جیسے مچھلی کا کانٹا پھنس گیا ہو۔
" رام بابو کو لکھنے پڑھنے میں بڑی دلچسپی تھی۔ اور رنگ ریکھا کے انہوں نے ادبھت سنسار رچے ہیں۔ یہی ان کی زندگی کی سادھنا تھی۔ بڑے خوش قسمت ہوتے ہیں وہ لوگ جنہیں —" میں نے کہا۔
کشن پرشاد اور اس کے باپ نے منفی اثبات میں سر ہلایا اور کھانے میں مصروف رہے۔ میرا نے میری طرف دیکھا اور پھر اپنے خاوند کی طرف اور کھانے میں مصروف ہو گئی۔
میرا تمہارا کیا حال ہے؟ اب تو تمہیں کافی فرصت ملتی ہو گی تصویریں بنانے کے لئے —" میں نے پوچھا۔
" فرصت تو کافی ہے۔ لیکن سنا ہے آدمی کی کایا کلپ ہو جاتی ہے" اس نے بغیر کسی جذبے کے کہا۔
" لیکن آدمی کا جسم بدلتا ہے۔ دل نہیں" میں نے کہا۔"
" ہاں دل بدلتا نہیں۔ مر تو سکتا ہے" اس کی آواز میں ارتعاش تھا۔ میں سمجھ گیا کہ میرا کے دل میں کسی چیز نے دم توڑ دیا ہے۔ میں نے مناسب نہیں سمجھا کہ اس سے اس موضوع پر بات کروں۔ وہ دن میں کبھی نہیں بھولوں گا۔ جب میرا نے پہلی تصویر بنائی تھی۔ اس کے سفید کپڑوں پر لال، پیلے نیلے، ہرے رنگوں نے پرنٹ کا عجیب ڈیزائن بنا دیا تھا۔ اس کے پریشان بال پیشانی پر بکھرے ہوئے تھے۔ اور چہرے پر پسینے کی بوندیں رنگ آمیز تھیں۔ ہونٹ جیسے پیاس کے باعث خشک ہو چکے تھے۔ بغیر آستین کے اس کی پتلی پتلی باہیں کسی مشینی پرزے کی طرح حرکت کر رہی تھیں جیسے کائنات کا کوئی وجود نہیں

محض میرا ہے اور اس کا کینوس رنگ اور تخیل کی دنیا۔ میرا کی تصویر اس کے سمجھانے کے باوجود میری سمجھ میں نہیں آئی تھی۔ لیکن رنگوں اور ریکھاؤں کی یہ کمپوزیشن میری آنکھوں کو بڑی اچھی لگی تھی۔ میں نے کہا "میرا تم تو بڑی تھک گئی ہو۔ کچھ آرام کر لو۔" وہ خشک ہونٹوں سے مسکرا رہی تھی۔

جب میں نے سنگیت سیکھنا شروع کیا تھا تو بابا کہتے تھے "ریاض کرو۔ ریاض زندگی کے ہر حسن کے حصول کے لئے ضروری ہے۔ چاہے وہ آرٹ ہو یا عشق یا گیان۔"

میرا کے بغیر میں رام بابو کے کمرے کا تصور ہی نہیں کر سکتا تھا۔ رام بابو کے گھر کئی قسم کے لوگ آتے تھے۔ آرٹسٹ، ادیب، سوچ وچار کرنے والے محض کافی پینے والے اور گپیں ہانکنے والے۔ یہ میرا ہی کا کمال تھا کہ وہ ہر آدمی کو اس کی دلچسپی کے مطابق ماحول میسر کر دیتی تھی۔ اگر آرٹسٹ ہو تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ رام بابو کا کمرہ ایک اسٹوڈیو ہے جس میں رنگ روپ دھارن کرتے رہتے ہیں۔ اور اگر کوئی ادیب ہے تو یہ خیال ہوتا تھا کہ الفاظ طشتریوں میں تیر کر سروں میں ڈھل رہے ہیں۔ رام بابو کے کمرے میں ایک شیلف پر ہندی، اردو، انگریزی اور بنگلہ کی کتابیں اور کچھ رسالے پڑے رہتے تھے۔ معلوم نہیں رام بابو ہر موضوع پر کوئی نہ کوئی مستند کتاب اس مختصر سے شیلف سے کیسے نکال لیتے تھے۔

"رام بابو ان دنوں فرائیڈ کا بڑا چرچا ہے کوئی کتاب ہے؟" وہ کتابوں کو الٹ پلٹ کر دیکھتے اور فرائیڈ کے تحلیل نفسی پر لیکچرز کی کتاب آپ کو دیدیں گے۔ اور جب آپ کتاب لوٹائیں گے تو وہ ایک اور کتاب پڑھنے کی سفارش کریں گے۔ "فرائیڈ کے بعد ان لوگوں نے نفسیات کے شعبے میں بڑا کام کیا ہے۔" پھر کوئی ان سے اپنشد کی فلاسفی کا چرچا کرتا تو وہ سنسکرت کے کچھ شلوک پڑھتے اور ان کی تشریح کرتے جاتے "برہم نہ اسے انتر پران، نہ من نہ وگیان۔ برہم تو آنند ہے۔

آنند و برہم ایتی ویجانات"۔ اور پھر بحث اس بات پر زوروں سے چل پڑتی کہ سب علم کس طرح ایک ہی سچائی کی کھوج میں ہیں۔ وہ ڈارون ہو یا ہکسلے، مارکس ہو یا فرائیڈ، آئین اسٹائین یا برٹرینڈ رسل یا اروندو گھوش۔ پھر معلوم نہیں کتنے دانشوروں کے خیالات پیش کئے جاتے۔ کتنی کتابوں کے حوالے دئے جاتے کتابیں پڑھی جاتیں اور رام بابو نئے سرے سے کافی بناتے ہوئے کہتے۔ ستیم، شوم، سندرم۔

ان ساری بحثوں میں ننھی میرا ایک موڑھے پر بیٹھی ہمارے چہروں کے بدلتے ہوئے رنگوں اور آواز کے مدوجزر کو حیرت سے دیکھتی سنتی رہتی۔ جیسے وہ اپنے تخیل میں سچائی کی کھوج کی تصویر بنا رہی ہے۔ اس کے چہرے پر ایسی روشنی نمودار ہوتی جیسے اس نے صداقت کو پالیا ہے۔ اور ہم سب ابھی تک تاریک راہوں میں نہ جانے کتنی صدیوں سے بھٹک رہے ہیں۔ بارہا ایسا ہوتا کہ کئی کتابیں میرا کی سمجھ سے باہر ہوتی تھیں۔ پھر وہ انہیں الٹ پلٹ کر دیکھتی اور قرینے سے انہیں اپنی جگہ پر رکھ دیتی تھی۔ وہ کہتی تھی کہ کتابوں کو اس طرح چھونے سے، انکی گرد صاف کرنے سے اور انہیں قرینے سے رکھنے سے ان سے گہری دوستی ہوجاتی ہے۔ جیسے بچے کو گود میں لینے سے چاہے آپ اس کی زبان سمجھیں یا نہ سمجھیں۔

بات چیت کے دوران میں ہمیں معلوم ہی نہ ہوتا تھا کہ کس وقت میز پر کافی کے پیالے آجاتے تھے۔ اور ہمارے ہاتھ پیالوں کی طرف بڑھ جاتے تھے۔ میرا اس بات کا خاص خیال رکھتی تھی کہ ہماری بحث میں کسی طرح کا خلل نہ پڑے ایک روز بات بڑی دلچسپ چل رہی تھی۔ رام بابو کا خیال تھا کہ جینیس کے لئے جنون لازمی شرط ہے اور ہماری رائے تھی کہ جینیس اور جنون میں کوئی رشتہ نہیں رام بابو اپنی ضد پر اڑے رہے کہ جینیس کے لئے جسمانی یا روحانی طور پر چوٹ کھایا ہونا ضروری ہے۔ جب ڈیموڈوکس سے اس کی بینائی چھین لی گئی تو تب اسے سنگیت کی نعمت ملی۔ میز پر کافی آگئی تھی۔ لیکن چینی نہیں تھی۔ میں نے میرا کی جانب دیکھا۔

اس نے میری طرف بڑی عجیب نظروں سے دیکھا۔ میرا جیسی سوشیل لڑکی سے یہ گستاخی کیسے ہو گئی لیکن اچانک مجھے احساس ہوا کہ غلطی میری تھی جس موضوع پر بات ہو رہی تھی۔ میرا اس میں بڑی دلچسپی لے رہی تھی اور ایسی حالت میں اسے رسوئی گھر میں بھیجنا اس پر بڑا ظلم ہے۔ اور یہ اس کی عادت بن گئی تھی کہ اگر بحث زوروں سے چل نکلی تو وہ کافی کا سارا سامان کمرے میں لے آئے گی تاکہ اسے درمیان میں نہ اٹھنا پڑے اور وہ اس وقت تک دوسرے کمرے میں نہ جاتی تھی جب تک کہ بحث ختم ہو جاتی۔ یہ تو میرا کی عادت ہی تھی کہ وہ کسی نہ کسی بہانے بحث میں شامل ہو جاتی تھی۔ اور خاموشی سے سب باتیں سنتی رہتی۔ کبھی کبھی وہ ہماری بحثوں میں شریک نہیں ہوتی تھی۔ اور چپ چاپ گھٹنوں کے بل بیٹھ کر ٹیبل لیمپ کے نیچے پریوں کی کہانیاں پڑھتی رہتی "یہ پری دلیش کہاں ہے بابا" اس نے پوچھا تھا۔ رام بابو نے اس کے سر پہ انگلی رکھ کر کہا تھا "یہاں۔ اوہ یہاں"۔ وہ اپنے سر پہ چپت مار کر مسکرا دی۔

"لیکن بابا پری پر جن کیوں لگدھ ہو جاتا ہے۔ اور اسے اپنے قید خانے میں ڈال لیتا ہے۔"

"اس لئے کہ جن ہوس کار ہوتا ہے۔ لیکن ایک دن اس پری کا حقیقی عاشق شہزادہ آتا ہے اور اسے جن کی قید سے آزاد کر دیتا ہے"

"کیا وہ شہزادہ آتا ہے" اس نے پوچھا۔

"ہاں ضرور آتا ہے" رام بابو نے کہا۔

ایک روز رام بابو نے کسی میگزین سے امرتا شیر گل کی سیلف پورٹریٹ کی تصویر کاٹی اور اسے ایک نہایت ہی خوبصورت فریم میں سجا کر دیوار پر آویزاں کرنے لگے۔ میرا نے ہتھوڑی پکڑاتے ہوئے پوچھا۔

"یہ تصویر کس کی ہے؟"

"امرتا شیر گل کی"

"کس نے بنائی ہے؟"

"اس نے خود ہی بنائی ہے"

"بڑی سندر ہے۔ میں اس سے ضرور ملوں گی۔

رام بابو نے آہ بھرتے ہوئے کہا۔" اب وہ اس دنیا میں نہیں رہی۔ حسن اور فن جب ایک ہی فنکار میں اکٹھے ہو جاتے ہیں تو وہ شعلے کی طرح بھڑک کر بھسم ہو جاتا ہے۔"

میرا کچھ دیر خاموش رہی پھر جیسے اچانک وہ ایک دم بڑی ہو گئی ہو۔ میں بھی امرتا شیرگل بنوں گی۔ ایسی ہی سندر تصویریں بناؤں گی اور پھر شعلے کی طرح بھڑک کر بھسم ہو جاؤں گی۔"

رام بابو ایک ٹک اس کی طرف دیکھتے رہ گئے۔ اور انہوں نے اسے سینے سے لگا لیا۔

رام بابو کے کمرے میں لکڑی کا ایک دیوان تھا جس پر وہ سوتے بھی تھے اور پڑھتے لکھتے بھی تھے۔ اکثر کھانا بھی وہیں بیٹھے بیٹھے کھایا کرتے تھے۔ ایک تکیئے کے سہارے لیٹے لیٹے وہ خلا سے پرے کا سفر کر لیتے تھے۔ ویسے کونے میں ایک میز پڑی تھی۔ جسے وہ کھانے پڑھنے کی میز کہتے تھے۔ اس پر قلم دوات، کاغذ، کچھ کتابیں، ٹیگور کا چھوٹا سا بت۔ ایک جاپانی گڑیا، رامیشورم سے لایا ہوا شنکھ، کچھ پھول اور اسی قسم کی دوسری چیزیں پڑی رہتی تھیں۔ انکی بیوی کی موت کو کافی عرصہ ہو گیا تھا۔ بس میرا ہی تھی گھر میں سب کچھ جو کھانا بناتی تھی۔ برتن صاف کرتی تھی۔ کپڑے دھوتی تھی۔ کمرہ سجاتی تھی۔ رام بابو کس وقت چائے پیتے ہیں۔ کب کھانا کھاتے ہیں۔ سب وقت پر انہیں تیار ملتا تھا۔ جب وہ اپنے کام پر جاتے تھے تو وہ انکے بستر، کرسی، فرش، مونڈھے سے کتابیں، پنسل، رنگ کاغذ اٹھا کر ہر چیز قرینے سے رکھتی تھی۔

کئی بار ایسا ہوتا تھا کہ رام بابو کا دروازہ بند ملتا تھا۔ اور میرا جھوٹ بول دیتی تھی"۔ بابا تو سو رہے ہیں اور ہم اس کی شرارت سے واقف ہو چکے تھے کہ وہ رام بابو سے کوئی نظم سن رہی ہو گی یا بحث کر رہی ہو گی یا شطرنج کھیل رہی ہو گی یا محض چائے پی رہی ہو گی۔ اور وہ نہیں چاہتی کہ اسے اس وقت کوئی ڈسٹرب کرے۔

جب رام بابو علیل ہو گئے تو میرا نے ہماری ملاقاتوں پر کچھ روک لگا دی۔ رام بابو اپنے دیوان پر پڑے پڑے ہی کھانا کھاتے تھے۔ اور پڑھتے رہتے تھے۔ اور جب کوئی خوبصورت

نظم یا پیرا پڑھتے تو میرا کو ضرور سناتے۔ لیکن آخری عمر میں ان کی زبان میں لکنت آگئی تھی۔ جب وہ پیالا اٹھاتے تھے تو ان کے ہاتھ کانپنے لگتے۔ آخر دنوں میں تو ان کی بینائی بھی جاتی رہی اور میرا ان کو نئی کتابیں پڑھ کر سناتی تھی۔ کتابوں کا انتخاب میرا ہی کرتی تھی۔ اور مجھے اس کے حسنِ انتخاب کی داد دینی پڑتی ہے۔

"وکیل صاحب آپ کس سوچ میں پڑ گئے" کشن پرشاد نے کہا، میں چونکا، ایک دم جیسے میں رام بابو کے کمرے سے نکل کر کشن پرشاد کے گھر آ گیا۔

"ایسے ہی، میرا کو دیکھ کر رام بابو کی یاد آ گئی تھی، کیا آدمی تھے۔" میں نے ہاتھ پونچھتے ہوئے کہا۔

کھانا ختم کر کے ہم ڈرائنگ روم میں آ گئے۔ ڈرائنگ روم میں کافی پیتے ہوئے کشن پرشاد نے مجھے سونے کا سگریٹ کیس دکھایا جس میں ایک برہنہ عورت کی صورت تھی۔ "یہ سگریٹ کیس ہانگ کانگ سے سمگل کیا گیا ہے۔ دیکھئے جب آپ یہ بٹن دباتے ہیں تو یہ عورت ناچنے لگتی ہے اور گھنٹیاں بجنے لگتی ہیں۔"

کشن پرشاد نے بٹن دبا کر عورت کے ناچنے اور گھنٹیاں بجنے کا منظر دکھایا۔

"یہ دیوان جو آپ دیکھ رہے ہیں نا ایک امریکن نے ڈیزائن کیا تھا۔ میں نے بڑی مشکل سے لسوا اس پور کے مہاراجہ سے حاصل کیا ہے۔" کشن پرشاد نے کہا۔ اور اس دیوان پر بیٹھ کر دکھایا۔ میں نے دیکھا میرا کی آنکھوں میں عجیب بے بسی تھی۔ اس نے میری طرف دیکھا اور نظریں جھکا لیں۔ جیسے اس کی آنکھوں میں روشنی ایک دم بجھ گئی ہو۔

"میری طبیعت ذرا ٹھیک نہیں، معاف کیجئے گا" یہ کہہ کر وہ اپنے کمرے میں چلی گئی۔ کشن پرشاد اسے کمرے سے باہر نکلتے دیکھتے رہے۔ تھوڑی دیر بعد مقدمے کے بارے میں بات چیت کر کے میں اپنے کمرے میں آ کر سو گیا۔ نامعلوم کیوں میرے ذہن میں رام بابو کا کمرہ بار بار گھوم رہا تھا۔ ان کا لکڑی کا دیوان لکھنے پڑھنے کی میز، کتابوں کا شیلف، امرتا شیر گل کی پورٹریٹ، جاپانی گڑیا، ٹیگور کا بت

سفید سنکھ ۔ کیا ماحول تھا۔ ان کے کمرے میں داخل ہوتے ہی ایک عجیب سا احساس ہوتا تھا جیسے آدمی کسی بچے کے ذہن میں داخل ہو گیا ہو اور ہر چیز کو چشم حیرت سے دیکھ رہا ہو۔ کبھی کبھی مجھے ایسا محسوس ہوتا تھا کہ میں کسی ابتدائی انسان کی غار میں بھٹک گیا ہوں جہاں اندھیرے میں مشعل لئے انسان فطرت کی تصویر کشی کر رہا ہے۔ لیکن بہر حال میں نے محسوس کیا ہے کہ رام بابو کا کمرہ کسی تخیل کار آرٹسٹ کا کینوس ہے جس پر رام بابو رنگ اور ریکھا کی نت نئی دنیا کی تشکیل کر رہے ہیں۔

صبح ہم سب ناشتے کے لئے اکٹھے ہوئے۔ میرا چپ بیٹھی تھی۔ مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے رات بھر کوئی درد زہر بن کر اس کی رگوں میں بہتا رہا ہے اور اس کا سارا بدن نیلا ہو گیا ہے۔

رات آپ آرام سے تو سوئے نا"، کشن پرشاد نے پوچھا۔

"ہوں، لیکن مجھے ایک عجیب سا خواب آیا۔ ایک بہت بڑی کتاب کھلتی ہے۔ اس میں سے ایک پری نکلتی ہے۔ ——————— اس کے ہاتھ میں برش ہے جس سے وہ ایک مجسمے کو چھو لیتی ہے اور اس مجسمے سے سنگیت کی شعاعیں پھوٹتی ہیں اور پھر ایک اندھیرے غار میں سے گزر کر وہ پری ایک ایسے دیش میں پہنچ جاتی ہے جس میں جس جانب نگاہ اٹھتی ہے سونا ہی سونا ہے۔ پری جونہی ٹھہر کر پیچھے دیکھتی ہے۔ وہ ایک دم سونے کی پرتیما بن جاتی ہے۔ اس پری پر ایک شراپ کا اثر تھا اور جب تک دور دیش سے کوئی شہزادہ نہیں آئے گا وہ سونے کی پرتیما بنی رہے گی۔"

"تو کیا پھر وہ شہزادہ آیا"۔ میرا نے پوچھا۔

"معلوم نہیں۔ اس کے بعد میری نیند کھل گئی"، میں نے کہا۔ میرا خاموش ہو گئی۔

دیر تک باتیں ہوتی رہیں۔ کشن پرشاد مقدمے کی روداد پر بات چیت

کرتے رہے۔ مجھے دوپہر کی گاڑی سے واپس جانا تھا۔ اور میں تیاری کرنے کے لئے اپنے کمرے میں چلا گیا۔

رات کو جب کشن پرشاد گھر لوٹے تو میرا گھر میں نہیں تھی۔ نوکر نے بتایا کہ وہ دوپہر کو ہی اٹیچی کیس میں کچھ کپڑے اور رام بابو کی کچھ پرانی چیزیں ڈال کر کہیں چلی گئی ہے۔ اور کہہ گئی ہے کہ کوئی پوچھے تو کہہ دینا کہ شہزادہ آ گیا ہے۔ سونے کی پرتیما پری بننے جا رہی ہے۔

بچّہ رو رہا ہے

بچہ رو رہا ہے۔

کوئی بات نہیں۔

کوئی بڑی بات نہیں۔ بچے اکثر روتے ہیں۔

مگر یہ بچہ کیوں رو رہا ہے ؟

اس لئے کہ وہ غلاظت اور گندگی کے ڈھیر پر پڑا ہے!

لیکن میں تو کبھی بھی نہیں رویا۔

میری زندگی غلاظت اور گندگی کے ڈھیروں پر گذری ہے۔

شاید وہ تنہا ہے۔

لیکن میں بھی تنہا ہوں۔

بالکل تنہا۔ صحرا میں درخت کی طرح۔

ماں باپ، بھائی بہن، بیوی — میرا کوئی نہیں۔

میرا کوئی بھی نہیں۔

— اور میں پھر بھی نہیں روتا۔

"شاید یہ اپنی ماں سے بچھڑ گیا ہے!" اس لئے رو رہا ہے۔

"ابھی بچہ ہے۔ بڑا ہو جانے دو۔ وہ خود بخود سمجھ جائے گا۔ کہ بچے ماں کے لئے، اور ماں بچوں کیلئے روتی ہے۔"

جب میری ماں مری تھی تو شاید میں بھی رویا تھا۔

اس لئے نہیں کہ وہ میری ماں تھی۔ بلکہ اس لئے کہ ہر بچہ پیدا ہوتے ہی روتا ہے۔
معلوم نہیں میں کیوں رویا تھا۔
شاید میں نہیں رویا تھا۔
مجھے کچھ یاد نہیں۔
میری ماں تھی بھی یا نہیں۔
میری ماں کیسی تھی۔ خوبصورت تھی۔ بوڑھی تھی یا جوان۔ مجھ سے پیار کرتی تھی یا نفرت۔
میرا پیدا ہونا۔ اور اس کا مرنا ایک ہی عمل تھا
عجب بات ہے۔
بڑی عجیب بات ہے۔
(کسی کو جنم دینے کے لئے مرنا کیا عجیب بات نہیں۔؟)
مجھے اس بچے کو اٹھا لینا چاہیئے۔
انسانیت پرستی۔
نہیں!۔
ایسے ہی بچے کا اس طرح رونا کچھ عجیب سا احساس دیتا ہے۔
کہیں پولیس والے ہی نہ دھر لیں۔ کہ بچے اٹھانے والا ہے۔
آج کل شہر میں بچوں کو اغوا کرنے والا گروہ آیا ہوا ہے۔
یہ لوگ بچے کیوں اٹھاتے ہیں۔؟
عجب بات ہے کچھ لوگ بچہ چھوڑ جاتے ہیں۔ اور کچھ اٹھالے جاتے ہیں۔
یہ لوگ سمجھوتہ کیوں نہیں کر لیتے۔
میں بھی اس بچے کو اٹھا لوں۔
لیکن پولس؟
کوئی بات نہیں۔
بچہ ابھی تک رو رہا ہے۔

پرماتما کے دھیان میں مگن ہونے سے روحانی قوت بیدار ہو جاتی ہے۔
روحانی قوت سے جسمانی آلائش دور ہو جاتی ہے۔
بھوک کا احساس مر جاتا ہے۔
احساس کے مر جانے سے بھوک بھی مر جاتی ہے۔
بھوک احساس کے سوا کچھ بھی نہیں۔
آدمی آسانی سے مر سکتا ہے۔
ہر آدمی کو مرنا ہے۔
اس لئے آدمی کو آسانی سے مرنا چاہئے۔
(اگر اسے مرنا ہی ہے تو پیدا ہونے کی کیا ضرورت ہے؟)
پیدا کوئی ہوتا ہے مرتا کوئی ہے۔
لیکن جو پیدا ہوتا ہے وہ مرتا ضرور ہے۔
جسم پیدا ہوتا ہے اس لئے مرتا ہے۔
روح پیدا نہیں ہوتی اس لئے نہیں مرتی۔
جسم کا مرنا لازمی ہے۔
اس لئے میری ماں میرے پیدا ہوتے ہی مر گئی۔
لیکن اس کی روح کہاں ہے۔
شاید اس بچے میں میری ماں کی روح ہو۔
شاید اس بچے کی ماں بھی مر گئی ہو۔ اور اب اسے بھوک ستا رہی ہے۔
جب اس کی بھوک مر جائے گی۔ تو اسے ماں کی یاد ستائے گی۔
اور یہ پھر روئے گی۔
زندگی دو چیزوں کا نام ہے۔
رونا اور مرنا۔
کیوں بیٹا آئس کریم کھاؤ گے۔؟

شاید اسے بھوک ستا رہی ہے۔
بھوک مجھے بھی ستاتی ہے۔
لیکن میں تو کبھی نہیں رویا۔
اتنی شدید بھوک میں لوگ رو کیسے لیتے ہیں؟
رونے کے لئے بھی طاقت کی ضرورت ہے۔

نہ رو میرے بچے نہ رو۔
زیادہ رونا اچھا نہیں۔
کبھی کبھار رو لینے سے آنکھ کا میل دھل جاتا ہے۔
زیادہ رونے سے آنکھ کی بینائی جاتی رہتی ہے۔
کبھی کبھی رو لینے سے دل کا درد دور ہو جاتا ہے۔
زیادہ رونے سے دل بجھ جاتا ہے۔
بجھے ہوئے دلوں سے کوئی آنسو ستارہ بن کر نہیں ٹپکتا۔

اس لئے رونا بے سود ہے۔
رونے سے پھیپھڑے کمزور ہو جاتے ہیں۔
آدمی اس لئے روتا ہے کہ وہ زندہ رہنا چاہتا ہے۔
اور اگر آدمی لگاتار روتا رہے۔ تو وہ جلدی مر جاتا ہے۔
اس کے مرنے کے بعد دوسرے لوگ روتے ہیں۔
(اگر دوسرے لوگ اس پر آنسو ضائع نہ سمجھیں، نفع بخش سمجھیں۔)

ورنہ کوئی نہیں روتا۔
یا مگرمچھ کے آنسو روتے ہیں۔
اور جو واقعی روتے ہیں۔ وہ بھی مرنے والے کی طرح قبل از وقت مر جاتے ہیں۔
لیکن بھوک سے بلک بلک کر مرنا مجھے پسند نہیں۔
اگر آدمی کو بھوک ستائے اور اسے کھانا نہ ملے تو اسے سمادھی لگا لینی چاہیئے۔

اُف کتنی گرمی ہے۔
آئس کریم کھانے سے آدمی کے گرم سرد ہو جانے کا خطرہ۔
"نمونیا"،
بہت سے بچے نمونیا سے مرجاتے ہیں۔
آئس کریم کھانا خطرے سے خالی نہیں۔
چنے مُرمُرے ....
پیٹ خراب کر دیتے ہیں
بچہ ابھی تک رو رہا ہے۔
اسے بھوک لگی ہے۔
شاید اس کے دودھ پینے کا وقت ہو گیا۔
دودھ پیوگے۔
بازار کا دودھ ہضم نہیں ہوگا۔
ہو جائے گا۔
کیونکہ وہ دودھ نہیں ہوتا۔
لیکن تم پیوگے کیسے۔؟
بغیر چینی کے، بغیر بوتل کے،
ایک بات کہوں۔
ذرا کان قریب لاؤ۔

سمجھ گئے نا، میں تمھیں دودھ کیوں نہیں پلا سکتا۔
جب تم بڑے ہو جاؤ گے۔ تو یہ سب باتیں خود بخود سمجھ جاؤ گے۔
(اگر اس دوران میں، تم بلک بلک کر، بھوک سے نہ مر گئے۔)
نہیں تم نہیں مروگے۔

میں ابھی تک زندہ ہوں۔

میں نے زندگی میں کبھی پیٹ بھر کر کھانا نہیں کھایا۔ جی بھر کر نہیں سویا۔

کل سے کچھ بھی نہیں کھایا۔

میں پھر بھی زندہ ہوں۔

تم بھوکے رہو گے اور زندہ رہو گے۔

آؤ گھر چلیں۔

اگلے موڑ پر فٹ پاتھ پر میرا گھر ہے۔

پکا فرش ہے۔ بجلی کے کھمبے کے نیچے۔

بڑی روشنی ہے۔

قریب ہی میونسپل کمیٹی کا نل ہے۔

چند گز کے فاصلے پر نانبائی کی دوکان ہے۔

نان کی خوشبو سے بڑی بھوک لگتی ہے۔

نان بائی کی توند باہر کی طرف ہے۔ اور میری اندر کی طرف۔

دونوں کو ملا کر دو نارمل پیٹ بن سکتے ہیں۔

یہ فلسفے یا سیاست کی بات نہیں۔

سادہ حساب کتاب ہے۔

تم حساب کتاب نہیں جانتے۔

تواریخ جغرافیہ ہے ــــــ

جب تم اسکول جاؤ گے تو سب کچھ سیکھ جاؤ گے۔

(اسکول جانے سے پہلے اگر تم نے بوٹ پالش کرنا شروع نہ کر دیا تو)

اور پڑھ کر سونے کا بیوپار کرو گے۔

رولڈ گولڈ یا امی ٹیشن کا۔

تمھیں سونا پسند ہے۔ خالص سونا۔

لیکن سونا بھوک نہیں مٹا سکتا۔
سونے کے بدلے نان ملتا ہے۔
اور نان سے بھوک مٹتی ہے
(اے میرے ننھے دوست اس لئے سونا نان سے زیادہ ضروری ہے۔)
اس لئے بڑے لوگ نان کے لئے نہیں۔ سونے کے لئے لڑتے ہیں۔
اور جو بڑے نہیں ہوتے نان کے لئے لڑتے ہیں۔
اس لئے انہیں نہ نان ملتا ہے نہ سونا۔
پھر وہ روتے ہیں۔
تم ابھی تک روئے جا رہے ہو۔
اب تو تمہارا گلا بھی بیٹھ گیا ہے۔
تمہارے آنسو بھی خشک ہو گئے۔
یہ تمہاری ضد ہے کہ تم روئے جا رہے ہو۔
اتنا رونے چلانے کے بعد شریف آدمی خاموش ہو جاتے ہیں۔
اور جو بہت شریف ہوتے ہیں وہ روتے ہی نہیں۔
(میں بالکل نہیں روتا۔ اس لئے نہیں کہ شریف آدمی ہوں۔
شریف آدمی روٹی کے بجائے ہوا کھاتے ہیں۔
تم بھی شریف بنو گے۔
آؤ ہم دونوں تازہ ہوا کھائیں۔
جب مجھے بھوک لگتی ہے تو میں ہوا کھاتا ہوں۔
اور گارڈن میں تازہ اور صاف ہوا ملتی ہے۔
اس بازار میں ہر چیز کی طرح ہوا میں بھی ملاوٹ ہے
میں آہستہ آہستہ سانس لیتا ہوں۔ اور پھر دھیرے دھیرے سانس چھوڑتا ہوں۔
میرے پھیپھڑے بڑے مضبوط ہیں۔

تم بھی ایسے کرنا تمہارے پھیپھڑے بھی مضبوط ہو جائیں گے۔
پھر جتنا جی چاہے رو لینا۔
اُف تم پھر رونے لگے۔
تمہیں غبارہ پسند ہے۔
رنگ برنگ غبارہ ......۔
روٹ۔ غبارے والے ذرا دکھانا۔
دیکھو بیٹا۔
نہیں بھائی لے جاؤ نہیں چاہیئے۔
یہ میرا بھی معاملہ ہے کہ مجھے بھوک لگی ہوئی ہے۔
اب اسے کون سمجھائے۔ کہ رونے اور غبارے سے بھوک نہیں مٹتی۔
بھوک روٹی سے مٹتی ہے۔
روٹی ادھار سے ملتی ہے۔
ادھار کوئی نہیں دیتا۔
اُدھار محبت کی قینچی ہے۔
ادھار کی روٹی محبت کو ختم کر دیتی ہے۔
محبت کے بغیر آدمی آدمی نہیں رہتا۔
چوری کرنے کی ہمت نہیں۔
بھیک مانگنے میں شرم آتی ہے۔
شرم تو آہستہ آہستہ دور ہو جاتی ہے لیکن باسی روٹی ملتی ہے۔
بھیک مانگنا بڑی بات نہیں۔ باسی روٹی کھانا بڑی بات ہے
اس سے پیٹ خراب ہو جاتا ہے۔
اور آدمی جلدی مر جاتا ہے۔
اگر مرنا ہی ہے تو پھر چوری کیوں کیجائے۔ بھیک کیوں مانگی جائے۔

بس چپ چاپ بجلی کے کھمبے کے نیچے کھڑے لوگوں کو دیکھتے دیکھتے مسکراتے ہوئے آدمی مر جائے۔
اچھا بیٹا مسکراؤ، رونا دھونا بند کرو ورنہ میں غلاظت اور گندگی کے اسی ڈھیر پر کوڑے کرکٹ کی طرح پھینک آؤں گا۔
تم پھر رونے لگے۔
میں اتنی رعایت کر سکتا ہوں کہ تمہیں غلاظت کے ڈھیر کے بجائے۔ اسی باغ میں چھوڑ جاؤں۔
نرم نرم گھاس کے اوپر درخت کی چھاؤں میں اوپر نیلا آسمان ہے۔ اور ان گنت ننھے ننھے
ستارے ہیں۔ ستاروں کو دیکھتے جاؤ۔ اور روتے جاؤ۔ بڑا مزہ آئے گا۔
میں فٹ پاتھ پر واپس جا رہا ہوں۔
مالی آ رہا ہو گا۔ ساڑھے سات بجے کے بعد پارک میں بیٹھنا جرم ہے۔
فٹ پاتھ پر سونا جرم ہے۔
نانبائی کی روٹی چرانا جرم ہے۔
بھیک مانگنا جرم ہے۔
اور ..... بیٹا رونا بھی جرم ہے۔
تم بچے ہو۔ یہ باتیں نہیں سمجھتے۔
تم چھوڑ دیئے جاؤ گے اور میں دھر لیا جاؤں گا۔
اس لئے بچپن کے بعد زندہ رہنا بھی جرم ہے۔
یہ سرسراہٹ کیسی ہے؟
یہ رسی ہل رہی ہے؟
سانپ! .....
دھیرے دھیرے بڑھ رہا ہے۔
یہ تو بچے کی طرح بڑھ رہا ہے۔
بچہ سانپ سے نہیں ڈرتا۔
سانپ کتنا قریب آ گیا ہے۔
بچے کے قریب جاتے ہوئے ڈر لگتا ہے۔

اژدراس نے بچے کو ڈس لیا۔

موت اور نجات

بے رحم آدمی خالی ہے۔

لیکن بن کھلے مرجھا جانا۔

اس باغ میں کوئی پتھر نہیں، پھول ہیں۔

سانپ پھول سے نہیں مرتا۔

اسے پاؤں سے کچل دوں۔

۔لیکن میرے پاؤں ننگے ہیں۔

کوئی بات نہیں۔

سب کو مرنا ہے۔

اور اس بچے کے لئے مرنا۔

میری ماں بھی تو میرے لئے مری تھی۔

بچہ ایک دم کیوں چیخا؟

اس نے رونا کیوں بند کر دیا ہے۔

مجھے کچھ معلوم نہیں۔ نہیں اتنا یاد ہے کہ سانپ جھاڑی میں واپس چلا گیا ہے۔ میں نے بچے کی ٹانگ سے زہر چوس لیا ہے وہ بالکل نہیں رویا۔

اب وہ کبھی نہیں روئے گا۔

اگر آپ میرے قریب آئیں۔ اور کسی کو نہ بتائیں تو ایک بات کہوں۔

کان میرے قریب لاؤ۔

میرے منہ میں خون اور زہر بھرا ہے۔

میں بول نہیں سکتا نگل نہیں سکتا، تھوک نہیں سکتا۔۔۔۔۔

ن۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔
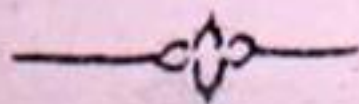
احساس کی کوئی منزل نہیں

دیر سے پہنچنے کے باعث آنند سے ملاقات نہ ہوسکی تھوڑی دیر ڈاکٹر سے بات چیت کرنے کے بعد میں گھر واپس آ گیا لیکن میرے ذہن میں صرف آنند تھا۔ یہ کیسے ممکن ہوسکتا ہے؟ میں سوچتا اور مجھے کوئی جواب نہیں ملتا تھا۔ ڈاکٹر کا سوال بار بار میرے ذہن میں ابھر آتا۔ جب میں ڈاکٹر سے گفتگو کرنے کے بعد ہاسپٹل سے باہر آنے لگا تو ڈاکٹر نے مجھے روک لیا وہ تھوڑی دیر خاموش رہا۔ اور پھر کہنے لگا۔ "آپ کب تک اپنے دوست کو ہاسپٹل میں رکھنا چاہتے ہیں؟"

کتنا لایعنی سوال تھا۔ میں نے سوچا، "جب تک وہ بالکل ٹھیک نہ ہو جائے۔" میں نے کہا۔

ڈاکٹر نے عینک کے دبیز شیشوں سے میری طرف دیکھا اور "ہوں" کہہ کر خاموش ہو گیا۔

"کیا کوئی خاص بات ہے؟ ڈاکٹر" میں نے پوچھا۔

"نہیں کوئی ایسی بات نہیں" وہ پھر چپ ہو گیا۔ میں بھی خاموش رہا۔

"میں سوچتا ہوں ایک صحیح الدماغ انسان کو کب تک ہاسپٹل میں رکھا جا سکتا ہے؟" ڈاکٹر نے کہا اور اپنے کمرے میں چلا گیا۔

میں سوچ میں پڑ گیا۔ یہ کیا معمہ ہے؟ ڈاکٹر کی رائے میں آنند کا دماغی توازن نہیں بگڑا۔ حالانکہ یہ حقیقت ہے کہ اس کا دماغ چل گیا ہے ورنہ کوئی شخص اپنے ہوش وحواس

میں چلا چلا کر کہہ سکتا ہے کہ اس نے اپنی بیوی کو زہر دیا ہے۔ جبکہ اس کی بیوی نے خودکشی کی ہے۔
میں دورے پر باہر گیا ہوا تھا۔ جب یہ حادثہ ہوا ہے واپس آنے پر پوری روداد معلوم ہوئی کہ
کس طرح آنند کی بیوی نے زہر کھا کر خودکشی کرلی ہے وہ کافی دنوں سے بیمار تھی ڈاکٹر کی رائے
میں اس کے بچنے کی کوئی امید نہیں تھی۔ آخر لوگ بیماری سے تنگ آ کر بھی تو خودکشی کرتے ہیں۔
اور اس میں کوئی تعجب کی بات نہیں تھی۔

واردات یوں بیان کی جاتی ہے کہ آنند جب بیوی کو دوا دینے کے لئے اس کے
کمرے میں گیا تو اس نے دیکھا کہ خلاف معمول دروازہ اندر سے بند ہے۔ اس نے دستک دی لیکن
دروازہ نہ کھلا۔ اس نے زور زور سے دروازہ کھٹکھٹایا۔ لیکن کوئی جواب نہیں ملا۔ کمرے میں
جیسے خاموشی کے سوا کچھ بھی نہیں تھا۔ ظاہر ہے اتنے زور سے دروازہ کھٹکھٹانے پر کوئی
کتنی ہی گہری نیند سویا ہو جاگ اٹھے گا۔ اڑوس پڑوس کے لوگ شور سن کر اکٹھے ہو گئے۔ دروازہ
زور زور سے کھٹکھٹایا گیا۔ لیکن اندر سے کوئی آواز نہ آئی۔ اور نہ ہی دروازہ کھلا۔ لوگوں نے سوچا
شاید بیماری جان لیوا ثابت ہوئی ہے۔ آنند کی بیوی مر چکی ہے۔ کچھ لوگوں نے بڑھ کر دروازہ
توڑ دیا۔ ان کی بات صحیح تھی۔ آنند کی بیوی مر چکی تھی۔ چہرہ بالکل سیاہ اور آنکھیں پھٹی پھٹی رہ گئیں
ابھری ہوئی۔ جیسے انتہائی کرب میں موت واقع ہوئی ہو۔ لیکن لوگوں کی حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی
جب معلوم ہوا موت بیماری سے نہیں خودکشی کے باعث ہوئی ہے۔ میز پر دوا کی شیشی کے
نیچے کاغذ کا ایک پرزہ پڑا ملا جس پر اس کی بیوی نے تحریر کیا تھا کہ وہ خودکشی کر رہی ہے۔ اس میں
بیوی کا دوش نہیں۔ خط پڑھ کر آنند جیسے پتھر کا بت بن گیا وہ ایک لمحہ اسی حالت میں رہا۔ اور وہ
بیوی کے چہرے پر نگاہ گاڑے رہا۔ اور پھر یک لخت اس سے لپٹ کر چلانے لگا "یہ سب
جھوٹ ہے تم نے خودکشی نہیں کی۔ میں نے تمہیں مارا ہے۔" ظاہر ہے وہ اپنی بیوی کی موت
کا صدمہ برداشت نہ کرسکا۔ اور انتہائی جذباتی ہو گیا جس سے اس کے ذہن پر برا اثر پڑا۔
اور نوبت یہاں تک پہنچی کہ اسے مینٹل ہاسپٹل داخل کرانا پڑا۔

میں آنند کے بہت قریب رہ چکا ہوں۔ وہ میرا دوست ہے میں یقین کے ساتھ
کہہ سکتا ہوں کہ اس کی فطرت سے یہ ممکن ہی نہیں کہ وہ کسی کی جان لے سکے یہ ممکن ہے

کہ صدمے کے باعث اس نے اپنا توازن نہ کھویا ہو بلکہ یہ احساس اس پر بری طرح طاری ہوگیا کہ اس نے اپنی بیوی سے بے پروائی کا سلوک کیا ہے اور وہ اسی باعث وہ خودکشی کرنے پر مجبور ہوگئی ہو۔ اور اسی باعث وہ یہ محسوس کرنے لگا ہو کہ وہی اپنی بیوی کا قاتل ہے۔ حالانکہ آنند جیسا نیک سیرت انسان کسی سے کیا بُرا برتاؤ کرے گا۔ لیکن اپنے اپنے احساس کی بات ہے اور آنند ذی حس انسان ہے۔ میں اس کی ذہنی کشمکش سے بخوبی واقف ہوں۔ وہ پیار کسی لڑکی سے کرتا تھا اور اسے شادی کسی دوسری لڑکی سے کرنی پڑ گئی۔ اور اس عمل کے لئے وہ ہمیشہ ذہنی کرب میں مبتلا رہا ہے۔ وہ ابھی کالج ہی میں پڑھتا تھا۔ جب رمنا اس کی زندگی میں داخل ہوئی مجھے اچھی طرح یاد ہے جب رمنا نے اس سے کہا۔ "آنند اب تو تمہیں احساس کی منزل مل گئی نا۔" آنند نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ "احساس کی کوئی منزل نہیں رمنا۔ مصیبت تو یہ ہے کہ میں منزل کو بھی اپنا ہمسفر بنا لیتا ہوں۔" رمنا کے پیار میں نے آنند کو واقعی سنجیدہ پایا اتنا سنجیدہ کہ میں نے سوچا کہ شاید وہ کبھی کہے گا "سنو دوست میں رمنا کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا۔ اگر میں اس سے جدا ہو گیا تو میری موت ہو جائے گی" لیکن آنند نے کبھی یہ نہیں کہا۔ اس لئے کہ وہ رمنا سے جدا ہو کر بھی زندہ رہ سکتا ہے۔ بلکہ اس لئے کہ شاید وہ جسمانی طور پر برسوں جی لے۔ مگر اس کی شخصیت فنا ہو جائے گی۔ اور اس میں شک بھی کیا ہے جس نے منزل کو اپنا ہمسفر بنا لیا ہے اس کی شخصیت کی تکمیل اس کے بغیر ناممکن ہے لیکن۔

یہ "لیکن" ذہن میں پہلے معصوم سوال کی طرح آتا ہے، اور پھر عمل میں ناگزیر نصیب کی طرح اور آخر کار قیامت کے شور میں بدل جاتا ہے۔ یہی حشر آنند کا ہوا۔ اس نے زندگی میں سامنے کے دروازے سے داخل ہونے کی کوشش کی، لیکن سب دروازے بند نظر آئے۔ اور چور دروازوں سے وہ داخل نہیں ہونا چاہتا تھا۔ باعزت اور اپنی صلاحیت کے مطابق۔ لیکن اسے کام نہ ملا۔ کوئی کام بھی نہیں ملا۔ لیکن وہ اس زہر کو پیتا رہا۔ اور رمنا سے بدستور ملتا رہا۔ رمنا سب جانتی تھی مگر بے بس تھی۔ آنند کی زندگی میں کرائسس تب آیا جب اسے یہ احساس ہو گیا کہ وہ ایک ناکارہ انسان ہے، وہ زندگی میں کبھی کامیاب نہیں ہو سکتا۔ ایک روز وہ میرے پاس آیا۔ وہ کافی دیر تک میرے سامنے گم سم بیٹھا رہا۔ میں نے سوچا کہ شاید اب وہ کام نہ ملنے کے باعث

مایوس ہو گیا ہے۔ اور یہ صحیح بھی ہے کہ ان حالات میں آدمی کب تک زندہ رہ سکتا ہے بالخصوص آنند جیسا ذی حس اور ذہین انسان زندہ نہیں رہ سکتا۔ میں نے پوچھا۔

"کیا بات ہے آنند، اتنے گم سم کیوں ہو؟"

"کچھ نہیں۔"

"آخر بات کیا ہے؟" میں نے پھر پوچھا۔

"مجھے اس کا غم نہیں کہ مجھے کام نہیں ملا۔ لیکن میں پوچھتا ہوں کہ مجھے کیا حق ہے کہ میں ایک معصوم لڑکی کی زندگی فنا کر دوں۔" وہ تقریر کے سے انداز میں بولا۔

"بات کیا ہو گئی ہے؟"

"آج رمنا آئی تھی اور میں اسے چائے کی پیالی تک نہیں پلا سکا۔ ایسے آدمی کو زندہ رہنے کا کوئی حق نہیں۔"

میں نے پہلی بار آنند کو اس جذباتی کیفیت میں دیکھا تھا۔ لیکن میں اندازہ کر سکتا تھا کہ اس کے دل پر کیا بیت رہی ہو گی۔ اس کے دل میں رمنا کے لئے کتنا پیار ہے۔ اور اپنے تمام تر خلوص کے باوجود جب وہ ایک مفلوج عضو کی طرح بے حرکت اور بے حس ہو رہا ہے تو اس کا دل ٹوٹ گیا۔ حسن و نغمہ کا متلاشی، منزل کو ہمسفر بنانے والا راہی ایک کنکر کی تلاش میں بھٹکنے پر مجبور ہو گیا۔ کنکر جو اس کا نشانِ منزل بن سکے۔ جس میں وہ اپنی ہستی کو مدغم کر دے۔

ایک دن اس نے رمنا سے کہا۔ "سنو رمنا۔ یہ تو بڑی فرسودہ سی بات ہے کہ میں کہوں کہ فکرِ معاش نے میرے احساسات کو زنگ آلود کر دیا ہے گو یہ صحیح ہے اور عشق کی تکمیل بغیر ـــــ"

"فکر کیوں کرتے ہو۔ آخر پڑھے لکھے نوجوان ہو۔ اور خوبرو بھی۔" رمنا مسکرائی، "کام مل ہی جائے گا کچھ سمے تو لگے گا ہی۔ اور پھر میں بھی تو کام کر سکتی ہوں۔"

آنند نے رمنا کے جذبے کو جھوٹا نہیں سمجھا، لیکن وہ جانتا تھا کہ جس دنیا میں رمنا اور اس نے جنم لیا ہے وہ جذبے کی قدر نہیں جانتی۔ اس دنیا میں پیار، حسن، سنگیت، رنگ و بو سب اجنبی ہیں اور زندگی تو غلام ہے چاندی کی سیاہ زنجیر کی۔ آنند چاہتا تو اسے

کام مل سکتا تھا لیکن اس کا معاوضہ بھی سیاہ زنجیر ہے۔ اگر وہ رمنا کو چھوڑ دے اور ایک ٹمبر مرچنٹ کی لڑکی سنتوش سے شادی کرلے تو اسے کام بھی ملے گا اور روپیہ بھی۔ آخر آنند نے زنجیر کے لیے ہاتھ بڑھا دیئے۔ اس نے سوچا اگر میں اسی طرح فاقہ کشی کی موت مر جاؤں تو کیا میرے عشق کی تکمیل ہو جائے گی؟ کیا رمنا کی روح کو تسکین مل جائے گی؟ ظاہر ہے نہیں تو پھر میں کیوں نہ زندہ رہوں اور زندگی کو ڈرامہ بنا لوں۔ حقیقت اور فریب، شادی کی حقیقت کو فریب میں بدل دوں۔ اور پیار کی حقیقت میرے رگ و پے میں سرایت کرتی رہے گی۔ آنند نے رمنا سے ذکر کیا۔ رمنا نے کہا، "ہاں شاید تم ٹھیک سوچتے ہو۔ میں تمہیں نہ کام دے سکتی ہوں، نہ روپیہ، میرے پاس سوائے پیار کے کچھ نہیں۔ جو کچھ تم کر رہے ہو وہ میں بھی کر سکتی ہوں آنند لیکن میں ڈرامہ نہیں کر سکتی۔ شاید تم کامیاب ہو جاؤ۔ میرے لئے نہ کوئی فریب ہے نہ کوئی حقیقت، بس ایک احساس ہے کہ تم مجھ سے پیار کرتے ہو" رمنا خاموش ہو گئی۔ میرا خیال ہے کہ رمنا کے اندر کی عورت جانتی تھی کہ زندگی زندگی ہے ڈرامہ نہیں ہے تم اپنے چہرے بدل سکتے ہو، عمل بدل سکتے ہو احساس نہیں۔ اور پھر رمنا تو ذکی حس لڑکی تھی۔

آنند نے مجھ سے مشورہ کیا، میرا جواب بھی رمنا کے جواب سے مختلف نہیں تھا میں جانتا تھا کہ ایک عورت آنند کی نسبت اچھا ڈرامہ کر سکتی ہے لیکن رمنا ایسا نہیں کر سکتی۔

میں کافی پینے کے لئے کیفے میں بیٹھا تھا، وہیں ڈاکٹر سے ملاقات ہو گئی۔ آنند کا ذکر آ گیا۔ میں نے آنند کی کہانی سناتے ہوئے کہا۔

" ڈاکٹر! آنند کی نسبت ایک عورت اچھا ڈرامہ کر سکتی ہے۔ لیکن رمنا ایسا نہیں کر سکتی پیار احساس ہے۔ شخصیت ہے، چہرہ نہیں، میں آنند کے رومانی قصے سے آپ کو بور نہیں کرنا چاہتا۔ لیکن آپ سوچ سکتے ہیں، کہ اسے کس کرب سے گزرنا پڑا ہو گا۔ اور رمنا کو بھی۔ جب اس نے ٹمبر مرچنٹ کی لڑکی سنتوش سے شادی کر لی۔ میں آپ کی توجہ خاص طور پر اس حقیقت کی طرف دلانا چاہتا ہوں کہ سنتوش کے لئے آنند کا سب پیار ایک فریب تھا۔ محض فریب، رمنا تو اس کی روح کی گہرائیوں میں داخل ہو چکی تھی۔ میں یہ نہیں کہتا کہ اس نے

سنتوش سے کوئی بدسلوکی روا رکھی ہو آنند ایسا نہیں کر سکتا۔ لیکن اس کی طرح میرا یہ وشواس نہیں کہ پیار کا فریب زیادہ دیر تک قائم رکھا جا سکتا ہے شاید ہی کوئی عورت اس فریب کو نہ جان سکے۔ یہ الگ بات ہے کہ وہ جانتے ہوئے بھی کسی باعث اس فریب میں مبتلا رہے۔ اور شاید سنتوش نے یہی کیا۔ شاید یہی غم اس کے روگ کا باعث بن گیا۔ اور وہ مستقل بیمار رہنے لگی۔ یہ بھی ممکن تھا کہ وہ رمنا کو آنند سونپ دیتی لیکن ڈاکٹر صاحب میرا خیال ہے کہ وہ آنند سے از حد پیار کرتی تھی۔ کیوں ؟ یہ میں نہیں جانتا۔ میرا نفسیات کا علم بالکل فیل ہو گیا ہے کہ آنند کی بے رخی اور صریحاً بے وفائی کے باوجود بھی سنتوش اس سے کیسے پیار کر سکتی ہے لیکن میرا پورا یقین ہے کہ وہ ڈرامہ نہیں کر سکتی۔ وہ رمنا سے مختلف لڑکی نہیں تھی۔

"اور یہ بھی ممکن ہے کہ آنند بھی سنتوش سے پیار کرتا ہو" ڈاکٹر نے کہا۔

"پیار سنتوش سے۔ ناممکن۔ بلکہ وہ تو اس سے بے رخی کا برتاؤ کرتا تھا۔" میں نے کہا۔

"ممکن ہے یہ بے رخی اس خوف کے باعث ہو کہ وہ سنتوش سے پیار کرتا تھا۔" ڈاکٹر نے آہستہ سے کہا۔

"ڈاکٹر صاحب آنند کو رمنا سے والہانہ محبت تھی اور ہے۔"

"مجھے اس میں کوئی شک نہیں۔ لیکن یہ بھی ممکن ہے کہ آنند کو رمنا اور سنتوش دونوں سے پیار ہو۔" ڈاکٹر نے کہا۔

"میرا خیال ایسا نہیں، یہ ممکن بھی نہیں۔"

"شاید آپ کو دوسری لڑکی ایسی نہ ملی ہو جس سے آپ پیار کر سکیں، پیار کی مدافعت بڑی مشکل ہوتی ہے۔"

"اگر آپ کی بات صحیح ہے تو پھر کسی شبہے کی گنجائش نہیں کہ آنند بے گناہ ہے۔" میں نے کہا۔

"یہی تو مسئلہ ہے دیویندر صاحب، آنند سنتوش سے پیار کرنے لگا تھا۔ اور جب اسے محسوس ہوا کہ وہ اب خود سپردگی کی منزل پر پہنچ گیا ہے تو اس نے اسے زہر دے دیا۔ میں یہ نہیں کہتا کہ سب کچھ اس نے سوچ وچار کر کے کیا ہے۔ ممکن ہے کہ لاشعوری طور پر۔

اسی سے یہ ہو گیا ہو جیسے وہ نہیں چاہتا تھا جیسے وہ سنتوش سے پیار نہیں کرنا چاہتا تھا۔"

"ڈاکٹر صاحب کہیں آپ پر بھی تو مینٹل ہاسپٹل کا اثر نہیں ہو گیا۔" میں ڈاکٹر کی یہ بے تکی دلیل سن کر خوب زور سے ہنسا۔

"شاید" ڈاکٹر نے کہا اور ہنسنے لگا۔

"کچھ لوگ تو یہ بھی کہتے ہیں کہ زہر آنند نے خریدا تھا اپنے لئے اور کھا لیا اس کی بیوی نے۔" ڈاکٹر تھوڑی دیر چپ رہنے کے بعد بولا "چلو قتل نہ سہی خودکشی ہی سہی، انجام تو ایک ہی ہے۔"

تھوڑی دیر تک باتیں کرتے رہے۔ کافی دیر ہو گئی تھی، ڈاکٹر نے کہا "اچھا اب کل ہی ملاقات ہو گی کل آپ آنند سے بھی مل سکیں گے۔"

گھر آکر میں کافی دیر تک سوچتا رہا کہ یہ مسئلہ کیا ہے اور سوچتے سوچتے سو گیا۔ اچانک میں ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ کیا یہ صحیح ہے؟ لیکن یہ تو خواب تھا۔ اور خواب میں نہ آنند تھا، نہ سنتوش، اور نہ رمنا۔ صرف میں تھا اور دو تصویریں۔ میں ایک تصویر بنا رہا ہوں۔ تصویر بناتے بناتے مجھے برسوں بیت گئے ہیں۔ تصویر میں میں اپنے خونِ جگر سے رنگ بھرتا ہوں۔ تصویر انگڑائی لے کر بیدار ہو جاتی ہے حسن و جمال کا زندہ پیکر بن کر میرے سامنے آجاتی ہے۔ اچانک میرے اور تصویر کے درمیان بادل چھا جاتے ہیں۔ گہرے سیاہ بادلوں کے دوسری طرف ایک اور کینوس پر چند ریکھائیں ابھر نے لگتی ہیں۔ میری آرٹسٹ روح کھل اٹھتی ہے اور میں فوراً برش لے کر اس میں رنگ بھرنے لگتا ہوں تصویر دھیرے دھیرے میری بیوی کا روپ اختیار کر لیتی ہے۔ میں حیران رہ جاتا ہوں، میرے پیچھے سرسراہٹ ہوتی ہے میں پیچھے مڑ کر دیکھتا ہوں۔ بادل چھٹ چکے ہیں اور میرا اولین شاہکار مسکرا رہا ہے۔ لیکن مجھے ایسا محسوس ہوا کہ مجھ سے کوئی گناہ سرزد ہو گیا ہے۔ وہ کون سا لمحہ تھا۔ میں نے تصویر کو آتش دان میں پھینک دیا، اور جب میں نے پیچھے مڑ کر دیکھا تو میرا شاہکار غائب ہو چکا تھا میری آنکھ کھل گئی اور پھر میں نہ سو سکا۔

دوسرے روز آنند سے میری ملاقات ہوئی۔ وہ چپ چاپ کمرے میں بیٹھا کتاب پڑھ رہا تھا وہ پڑھنے میں اتنا مگن تھا کہ میرے قدموں کی آہٹ بھی اس نے نہ سنی۔

"آنند" میں نے پکارا۔

وہ چونکا "ہیلو ڈیئر، تم یہاں کیسے؟" وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

"تمھاری طرح نہیں" میں مسکرایا "کہو کیا حال ہے؟" میں نے پوچھا۔

"ڈیئر! تم مجھے ہوش و حواس میں سمجھتے ہو یا مینٹل کیس! تاکہ گفتگو کا انداز طے ہو جائے"

اس نے کہا۔

"مکمل ہوش و حواس میں" میں نے کہا۔

"تو پہلے یہ سن لو کہ میں نے ہی سنتوش کو زہر دیا ہے۔ وہ بڑی پیاری لڑکی تھی، بالکل

رمنا کی طرح، مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے رمنا کو زہر دے رہا ہوں۔ اور اس نے کیا ستم کیا کہ

دروازہ اندر سے بند کر لیا اور خط میں لکھ دیا کہ میں خودکشی کر رہی ہوں۔ اس میں کسی کا دوش نہیں

رمنا بھی ایسے ہی کرتی۔ یہی حقیقت ہے میں نے ایسا کیوں کیا؟ اگر کوئی پاگل پن ہے تو

یہی ہے ورنہ"

وہ کتاب پیشانی پر رکھ کر گھٹنوں پر جھک گیا۔ میں خاموش رہا۔ اس نے اسی طرح

سر نیچے کئے کہا۔

"میں یہ مکمل ہوش و حواس میں کہہ رہا ہوں"

"مجھے یقین ہے" میں نے کہا اور اس کے سر کو اوپر اٹھایا۔

"مینٹل کیس سمجھے جانے سے مجرم سمجھا جانا زیادہ بہتر ہے" وہ تھوڑی دیر خاموش

رہا "مجھے اس جہنم سے کب نجات ملے گی"

"فکر مت کرو، دو ایک دن کی بات ہے، میں نے ڈاکٹر سے بات کر لی ہے۔ اس کا خیال

یہی ہے کہ تم خواہ مخواہ مصیبت میں پھنس گئے ہو"

تھوڑی دیر ادھر ادھر کی باتیں ہوتی رہیں۔ وہ ماضی کے اندھیرے سے کچھ یادیں سمیٹ رہا تھا

اور میں خاموشی سے سن رہا تھا۔ "رمنا بھی آئی تھی، بے چاری بڑی پریشان تھی" وہ کہہ رہا تھا

میں تھوڑی دیر بیٹھنے کے بعد چلا آیا۔ اس سے بات چیت کرنے کے بعد میں ڈاکٹر سے ملا

اور اسے ساری روداد سنائی۔ ڈاکٹر نے کہا کہ جتنی جلدی ممکن ہوا آنند کو چھٹی دلوا دے گا

"لیکن کیا؟" میں نے پوچھا۔

"آنند کی روح کو اس وقت تک چین نصیب نہیں ہو سکتا۔ جب تک کہ وہ سزا نہیں پائے گا۔" ڈاکٹر نے کہا۔

"یعنی پھانسی" میں نے کہا۔

"ضروری نہیں، پھر بھی" ڈاکٹر خاموش ہو گیا۔ اور دوسرے مریضوں کو دیکھنے کے لئے چلا گیا۔

چند دنوں بعد آنند ہاسپٹل سے واپس آگیا۔ اور اس نے نورمل طریقے سے اپنا کام کاج شروع کر دیا۔ رمنا سے اب بھی اسے شدید پیار تھا۔ لیکن نہ جانے کیوں وہ اس سے ملتے ڈرتا تھا۔ جیسے اس نے زہر سنتوکش کو نہیں رمنا کو دیا ہو۔ لیکن پھر کبھی اس حادثے کا ذکر آنند سے نہ ہوا۔

اس حادثے کو کافی عرصہ بیت گئے۔ میں ٹرانسفر ہو کر بمبئی چلا گیا۔ آنند سے کچھ عرصہ خط وکتابت ہوتی رہی، پھر اچانک بند ہو گئی۔ ایک دن اخبار میں پڑھا کہ دلی میں ایک آدمی کسی مجسٹریٹ کی عدالت میں پیش ہوا اور کہنے لگا۔ "میں نے اپنی بیوی کو قتل کیا ہے کیا قتل کی سزا موت نہیں۔" خبر تھی کہ اس آدمی نے کوئی دنگا فساد نہیں کیا اور مجسٹریٹ نے معائنے کے لئے اسے مینٹل ہاسپٹل بھیج دیا ہے۔

ہم شہر بدل گئے

کافی ہاؤس میں کوئی میز خالی نہیں تھی۔ میں واپس جاتے لگا کہ منوج نے اشارہ کیا۔ سامنے کھڑکی کے قریب منوج اور اس کے دوست کافی پی رہے تھے منوج نے میرے سامنے کرسی سرکاتے ہوئے کہا "نشا سے ملو"

"ہاؤ ڈو یو ڈو"

"ہاؤ ڈو یو ڈو"

"مسٹر جگ دیپ" منوج نے جگ دیپ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"سورامن ــــــ" یہ میرا نام تھا۔

منوج نے سب کے لئے کافی منگوائی۔ جگ دیپ یونیورسٹی میں "ڈان جوان" مشہور تھا اور نشا اپنے گورے چٹے رنگ اور لمبی سیاہ زلفوں کے باعث "اے پلس" سمجھی جاتی تھی۔ لیکن سرگوشیوں میں شالنی کے چرچے بھی ہوتے تھے منوج کا خیال تھا کہ جس راہ سے نشا گذر جائے آنچ محسوس ہوتی ہے۔ ور جس موڑ سے شالنی گذرتی ہے مہک آتی ہے۔ شالنی تو خیر کسی کو لفٹ نہیں دیتی تھی لیکن نشا کے گرد عام طور پر لڑکے بھونرا تے رہتے تھے۔

"ڈامن صاحب بڑے انٹی لیکچول ہیں، مارکس فرائیڈ، ژونگ، آئن سٹائن نہ جانے کیسے کیسے لوگ ان کے دوست ہیں" منوج نے کہا۔

"اول" نشاء نے کہا جیسے میں کسی مصیبت میں گرفتار ہو گیا ہوں۔

"اور اب کچھ کچھ کھٹ پرگیہ ہوتے جا رہے ہیں۔ ایک جیب میں بھگوت گیتا رکھتے ہیں اور دوسرے میں سلفے کی چلم" منوج نے پھر کہا۔

"کھٹ پرگیہ" "یہ کیا بلا ہوتی ہے" جگ دیپ نے پوچھا!

"آپ نے بھگوت گیتا نہیں پڑھی" منوج نے سوال کیا۔

"ہم تو غالبؔ کو گیتا سمجھتے رہے ہیں" جگ دیپ نے کہا اور سب کھل کھلا کر ہنس پڑے اور میں نے محسوس کیا کہ چند لمحوں میں ہی میرے خلاف "اینی مس" کا ماحول تیار ہو گیا ہے۔

"مس نشاء آپ کا نام آپ کے رنگ و روپ کے خلاف ہے اگر آپ کو مات سے اتنا ہی پیار ہے تو رجنی گندھا جیسا کوئی نام رکھ لیتیں" میں نے وار کیا۔

"یعنی جیسے رات کی رانی — کیوں امن صاحب" جگ دیپ نے کہا۔

منوج نے ماحول میں زہر اڑنے کی کیفیت کو محسوس کیا اور فوراً بولا۔

"ان کا اصلی نام نشی ہے۔ لیکن اب یہ بڑا کامن ہو گیا ہے۔ نشی میں جادو تھا۔ اور اب نشاء میں نشہ ہے" الفاظ اپنا جادو کر گئے۔ "ریگل میں کیا چینج ہوا ہے" نشاء نے بھی موضوعِ گفتگو بدلنے کی کوشش کی۔

"پریل ٹیلیمین گریگری پیک اور —"

"آئی ڈانٹ فار پیک —" نشاء نے ہونٹوں کا دائرہ بناتے ہوئے کہا۔

"جب وہ انڈیا آیا تھا تو ثریا سے اس کا افیر (AFFAIR) ہو گیا تھا"

"کیوں نہ ہو۔ یہ امریکی تو ہندوستان کے حسن پر مرمٹتے ہیں" منوج نے کہا۔

"ارے امریکنوں کی خوب کہی وہ تو ہر چیز پر مرمٹتے ہیں" مارلن منرو سے لے کر زین بدھ ازم پر — میں نے کہا۔

"سنا ہے ثریا پھر فلموں میں آ رہی ہے" نشاء نے کہا۔

"

"ارے بچہ تو ڈبی بی کے بھی ہوا ہے" منوج نے کہا۔

"واقعی" نشا نے چونکتے ہوئے کہا۔

"دکتنے نمبر کی شادی ہے۔"

"وہ بے چاری تو اپنے گھر سے کبھی نہیں نکل سکتی۔ تازہ ہوا کے لئے چھت پر نہیں جا سکتی۔ ہر وقت مکان کے دروازے اکھڑکیاں بند رکھنے پڑتے ہیں،" منوج نے کہا۔

"کیوں؟ شالنی نے پوچھا۔

"جس طرف دیکھو، فوٹوگرافر خفیہ کیمرے لئے اس کی تصویر لینے کے لئے تیار بیٹھے ہیں۔

حوا کے لباس سے لیکر ڈاؤر کے لباس تک ہیں"

اس نے نیند آور گولیوں سے خودکشی کی بھی کوشش کی تھی۔"

"چ چ۔ پور بی بی۔" نشا نے کہا۔

"ورنہ مارلن منرو بننے میں کیا کسر تھی۔"

"سوائے اس کے کہ اس نے آرتھر ملر جیسا خاوند نہیں ملا" میں نے کہا۔

"مجھے تو اس پر ترس آتا ہے۔ تم نے "اینڈ گاڈ کریٹیڈ دامن" دیکھی ہے جگدیپ نے کہا۔

"گاڈ۔ اسے تو شیطان نے پیدا کیا ہے۔" منوج نے کہا۔

کیوں۔ "رسن صاحب سنا ہے خدا مر گیا ہے۔ وہ آپ کیا کہا کرتے تھے،" خدا کا جنازہ لئے جا رہے ہیں فرشتے" ---------

"اعلان تو ہو چکا ہے۔ لیکن مصنوعی تنفس جاری ہے" میں نے کہا۔

"اب تو انسان کی موت کا بھی اعلان ہو چکا ہے بمبخت اس کا گواہ ہے۔"

"اطلاعاً عرض ہو جگ دیپ صاحب، اب لولیٹا پر بھی فلم بن چکی ہے پروڈیوسرز چاہتے تھے کہ لولیٹا کا پارٹ اس لڑکی کو دیا جائے جو ذہنی طور پر بھی لولیٹا ہو۔ میں نے جگدیپ کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

"اور جسمانی طور پر بھی" منوج نے کہا، "امریکہ میں ایسی سینکڑوں لولیٹائیں ہیں۔"

"آٹھ سوماؤں نے اپنی لڑکیاں اس رول کے لئے پیش کی تھیں۔ بھائی ایک خبر یہ بھی ہے"

"یہاں تک کہ ایرول فلائین نے بھی ـــ"

"سنا ہے سوئیٹی پون کو اس کے لئے چنا گیا ہے۔"

"سوئیٹی پون ـ کتنا رومانٹک نام ہے" نشا نے کہا۔

"مشکل سے پندرہ سال کی ہوگی۔"

"تم نے لولیٹا پڑھی ہے؟" میں نے پوچھا۔

"نشا ہونٹ سکیڑ کر رہ گئی"۔

"اور جناب آپ نے ـــ"

"کوشش کی تھی۔ بڑی بور کتاب ہے۔" جگ دیپ نے کہا۔

"اور کم بخت انگریزی میں لکھی ہوئی تھی اور وہ بھی خوبصورت انگریزی میں ـــ"

منوج نے کہا۔

"اگر ڈبر گمسین بیٹ سیلر باؤ گرانی پڑھو یا بیری مسین ـ"

"شالنی خاموش بیٹھی کافی پی رہی تھی۔

"آپ کو فلموں میں دلچسپی نہیں ـــ" میں نے پوچھا۔

"میری انفارمیشن اتنی زیادہ نہیں" اس نے ہونٹوں کو ہلکی سی حرکت دیتے ہوئے کہا۔

کلاس کا وقت ہو چکا تھا۔ سب اٹھ کر چلے گئے۔

"مسٹر رمن بل کے پیسے" نشا نے کہا۔

میں رک گیا۔ منوج میری طرف دیکھنے لگا۔ وہ شاید سمجھ گیا کہ میرا ردعمل کیا ہوگا

"مس نشا تمہاری عمر کیا ہے۔ ویسے لڑکیوں کی عمر پوچھنا ایٹی کیٹ کے خلاف ہے؟"

میں نے کہا۔

"کیوں۔ اٹھارہ سال؟" اس نے کہا۔

"اور میری عمر چوبیس سال ہے" میں نے کہا۔

"کیا مطلب؟" اس نے آفنس محسوس کرتے ہوئے کہا۔

"مادام نشا مطلب یہ ہے کہ جب میں اٹھارہ سال کا تھا تو لڑکیوں کے بل ادا کر دیا کرتا تھا۔"

"اور اب ـــــ" شالنی نے پوچھا۔

"اب تو جناب ذاتی جائیداد اور پیسے کے نظام کے خلاف ہیں" منوج نے ہنستے ہوئے کہا۔

"تم سمجھتے ہو تم بڑے خوبصورت ہو۔ ویری لس چارمنگ"، نشا نے غصے سے کہا اور اپنا پرس کھولا۔

منوج صرف اپنا بل ادا کرتا تھا، جگ دیپ صرف لڑکیوں کے بل کے پیسے دیتا تھا۔

اور نشا کا رجحان تھا مفت کا فی ـــــ شالنی کو اس سے کوئی سروکار نہیں تھا۔

"معلوم نہیں یہ وحشی گنوار شہروں میں کہاں سے نازل ہو جاتے ہیں۔" نشا نے بڑبڑاتے ہوئے کہا۔ اور جگ دیپ کے ساتھ کلاس روم میں چلی گئی۔ منوج اور شالنی لائبریری کی طرف روانہ گئے۔ میں کافی ہاؤس سے باہر نکل کر برآمدے میں آگیا۔ میں نے سگریٹ سلگانے کے لئے دیا سلائی جلائی۔ مجھے ایسا محسوس ہوا کہ میرے پیچھے ہولے سے آکر کوئی کھڑا ہو گیا ہے۔ اور میرے شانے پر جھک گیا ہے۔ چھایا، سانس، مہک، سرسراہٹ کا جھونکا سا آیا۔ میں نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔

"شالنی ـــــ" شاید پہلی بار میں نے شالنی کو اپنے اتنے قریب مہکتے ہوئے محسوس کیا تھا حالانکہ مجھے ہمیشہ یہ احساس ہوتا رہا ہے کہ شالنی کی نگاہیں کچھ تلاش کر رہی ہیں۔ اب پرم گیان حاصل کر کے میرے سامنے جھلملانے لگی ہیں۔

"تمہاری عمر کتنی ہے رامن؟" اس نے بڑی سنجیدگی سے پوچھا۔

"چوبیس سال" میں نے کہا۔

"اور میری بیس سال ہے" یہ کہہ کر وہ زور سے ہنسی۔ یہ لڑکی اس طرح کھل کر ہنس بھی سکتی ہے۔

وہ میرے ساتھ ساتھ برآمدے سے اتر کر لان میں آگئی۔ گیٹ سے باہر نکل کر سڑک کے کنارے ہم دھیرے دھیرے چلنے لگے۔ ہمارے پیچھے سورج غروب ہو رہا تھا۔ اور ہمارے سامنے سائے لمبے ہوتے جا رہے تھے۔ بس اسٹاپ پر شالنی رک گئی۔

"کتنی سردی ہے!" اس نے کہا۔

میں خاموش تھا۔

"تم نے سویٹر وغیرہ کچھ نہیں پہنا۔"

"نہیں"

"تم اپنی پروا نہیں کرتے، بیمار پڑ جاؤ گے۔"

"مجھے بیمار پڑنے کی فرصت نہیں؟" میں نے کہا۔ "آپ شاید الہ آباد میں تھے" اس نے اچانک کہا۔

"اگر میں غلطی نہیں کرتا تو آپ ــــ" میرا اندازہ درست تھا۔

"آپ کے فادر آج کل کیا کر رہے ہیں؟" میں نے پوچھا۔

"وہ ریٹائرڈ زندگی بسر کر رہے ہیں" "اولڈ مین لونلی نیس" دن بھر اسرار لندن پڑھتے ہیں اور رات بھر شراب پیتے ہیں اور اکیلے بیٹھ کر تاش کھیلتے ہیں"۔

"کیا اب بھی وہ ــــ ہر رات کو قبرستان جانے کی رسم پوری کرتے ہیں" میں نے پوچھا۔

"نہیں اب سرسوتی کی ایک سولہ سال کی سوت آ گئی ہے اور وہ گھر میں بری طرح الجھ گئی ہے۔"

"میرا مطلب یہ نہیں تھا" میں نے کچھ پریشانی محسوس کی۔ شالنی مسکرا دی۔ میں نے موضوع بدلتے ہوئے پوچھا۔

"وہ ایک بوڑھا تھا۔ کیا نام تھا اس کا؟" میں نے پوچھا۔

"فضل دین"

"کیا ابھی زندہ ہے؟"

"ہاں ہم سے زیادہ" شالنی نے کہا۔ "اب ہماری گلی میں بجلی کی روشنی آ گئی ہے۔ لیکن وہ اسی طرح لگاتار ہر شام اندھیرا ہوتے ہی اپنی بانس کی سیڑھی اٹھائے آتا ہے اور لیمپ کی جگہ پر مٹی کا دیا جلا کر چلا جاتا ہے۔"

"اور کلمہ بھی پڑھتا ہے، بلند آواز میں"

"ہاں"

"بوڑھا کچھ سنکی تھا" میں نے کہا۔

شالنی نے میری طرف غور سے دیکھا، جیسے وہ مجھے پہچاننے کی کوشش کر رہی ہے۔ کہ کیا میں ہی آدمی ہوں جسے اس نے الہ آباد کی اس گلی میں دیکھا تھا۔ اور مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے میں نے کچھ کھو دیا ہے۔

"تمہیں معلوم ہے کہ اس بوڑھے سنکی کا لڑکا پاکستان چلا گیا ہے۔ اور وہ ایک بار اسے لینے بھی آیا۔ لیکن اس سنکی نے جانے سے انکار کر دیا۔ کہتا تھا کہ گنگا جمنی کو چھوڑ کر مجھے دوسرے وطن لے جانا چاہتے ہو"

"شالنی تھوڑی دیر خاموش رہی۔"

"ہر شام روشنی بلانا سولئے سنک کے ممکن نہیں دوست اور اس سنک کیلئے سلیقے کی ضرورت نہیں پڑتی اور شاید بھگوت گیتا کی بھی نہیں ہے۔"

"اور وہ سانولی لڑکی، چھریرے بدن والی، کیا وہ اب بھی آتی ہے" میں نے کہا۔

"کون سانولی لڑکی؟" اس نے حیرت سے پوچھا۔

"وہ پھول والی سفید ساڑی پہنے، معصوم چہرہ، غمگین صورت۔"

شالنی پھر کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

"میں نے اسے کبھی نہیں دیکھا" اور پھر میری آنکھوں میں جھانک کر بولی۔

"تمہارے تصور کی گلی میں وہ ہر دن گزرتی ہے۔"

"میں اداس ہو گیا۔ میرے ذہن میں اس اندھیری گلی سے وہ لڑکی اب بھی گزر رہی تھی

"آج کل آپ کیا کر رہے ہیں؟" شالنی نے مجھے چونکا دیا۔

"جسم اور جیب کی ایکویشن سمجھنے کی کوشش کر رہا ہوں۔"

"اور کام؟"

"کام مجھے کوئی راس نہیں آیا یا شاید میں کسی کام کو راس نہیں آیا۔ لوگ اس

حالت کو مینس فٹ کہتے ہیں۔"
"تو پھر آپ لوگوں کو قتل کر دیں یا خود کشی کر لیں۔ اس سرد جنگ سے کیا حاصل"
شالنی نے کہا۔
"اس کی کیا ضرورت ہے؟ موت جسم اور روح کے رشتے کے ٹوٹنے کا نام ہے اور یہ رشتہ ٹوٹ چکا ہے قریب قریب ہر انسان میں۔"
سامنے سے بس آتی نظر آئی۔ شالنی نے اپنا شال جسم کے گرد لپیٹ لیا۔ اور دوڑ کر بس کے ہجوم میں شامل ہو گئی۔ میں اسٹاپ پہ کھڑا دور تک بس کو جاتے دیکھتا رہا۔ وہ بیک سیٹ سے شیشے ہی سے جھانک رہی تھی۔ موڑ پر مڑتے اس نے ہلکے سے ہاتھ ہلایا اور بس اگلے موڑ پر غائب ہو گئی۔
میں چپ چاپ پلیا پر بیٹھ گیا۔ اندھیرا اور گہرا ہونے لگا میں نے اپنی مقدس کتاب نکالی۔ لیکن سب الفاظ مدہم پڑ چکے تھے۔ اور جب کتاب کو روشنی نہ ملی تو پھر سلفے کی لاٹ کی روشنی ہی سہی۔ اور پھر میں نے دیکھا اس اندھیری سڑک پر وہ پھولوں والی سفید ساڑی پہنے۔ سانولے رنگ کی لڑکی گزر رہی تھی۔ اور میرے الفاظ اس کے آنچل میں دھیرے دھیرے بکھرتے جا رہے تھے۔

...دیویندر اسر۔ افسانہ نگار اور نقاد۔ پیدائش ۴ اگست ۱۹۲۸ء،
کیمبل پور (مغربی پنجاب) تعلیم ایم۔ اے (معاشیات۔ الہ آباد یونیورسٹی)
ایم۔ پی۔ ایس (کمیونی کیشن آرٹس، کارنیل یونیورسٹی۔ امریکہ) اردو، ہندی
اور انگریزی میں اب تک تیس کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ جن میں گیت اور انگارے،
شیشوں کا مسیحا، (افسانے) فکر اور ادب، ادب اور نفسیات، ادب
جدید ذہن، (تنقید) کے علاوہ ہندی میں جدید اردو ادب، اردو کی مذہبیہ
کہانیاں، اردو غزلیں، کی ترتیب بھی کی ہے۔ انگریزی میں جدید ہندی
افسانہ نگاری کے ادارے سے بھی منسلک ہیں۔